ارمان سرور

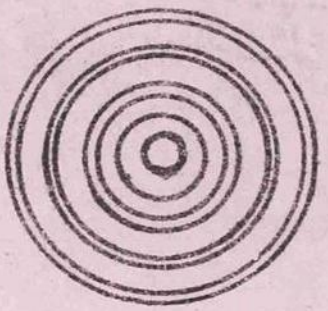

ارمان بلاروی

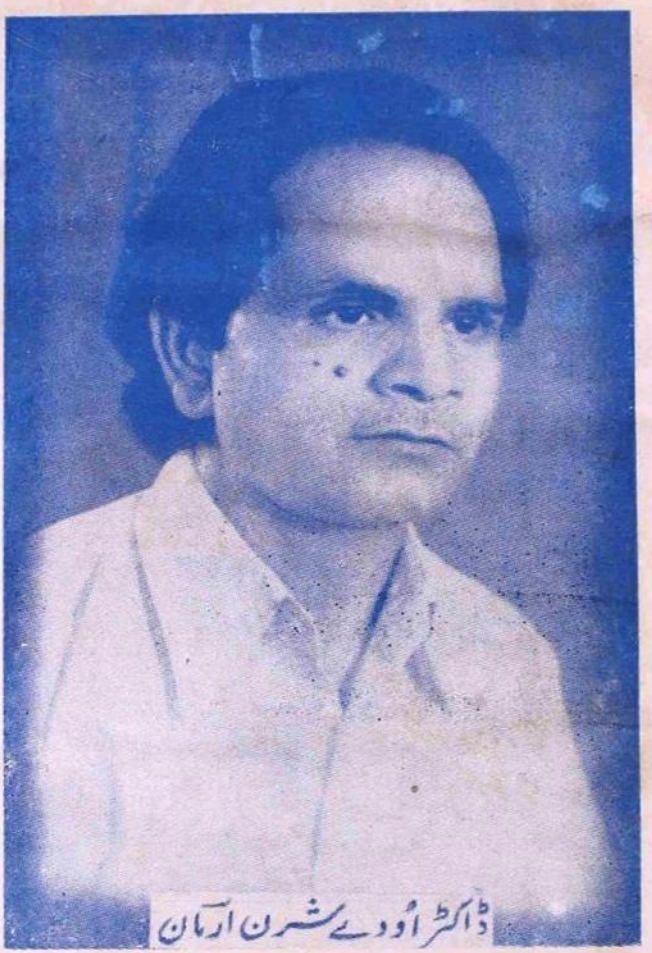

ڈاکٹر اُودے شرن ارمان

ایسی روٹی

"ماتاجی نمستے" سیوا نے ماں کو نمسکار کیا

"جیتے رہو بیٹا۔ تم آج ہی چلے آئے ساہو صاحب کے گھر سے؟" ماں نے سوال پورا بھی نہ کیا تھا کہ سیوا کی چھوٹی بہن پھلیا باہر سے آگئی اور آتے ہی کہنے لگی "بھیا تم تو کہتے تھے کہ ساہو صاحب کے بیاہ سے جب لوٹوں گا تو خوب پوڑی کچوڑی لاؤں گا۔ اب لاؤ کیا لائے ہو۔ مجھے تو بڑی بھوک لگی ہے۔"

"جا باہر جا۔ جو لایا ہوگا مل جائے گا۔" ماں نے اس کو ڈانٹتے ہوئے کہا اور آگے بولی "سیوا تو اداس کیوں ہے ہاتھ تو خالی ہیں ہی پیٹ بھی خالی ہے کیا؟" ممتا نے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا، بہن باہر کھیلنے جا چکی تھی۔

"ہاں ماتاجی مَیں بھوکا ہوں۔"

"تو نے وہاں کچھ نہیں کھایا؟"

"کوئی کھلاتا تبھی تو کھا لیتا۔"

"کسی نے نہیں کھلایا تو مانگ کر کھا لیتا۔ شادی میں گھر والے بھول بھی جاتے ہیں۔"

"ماتاجی مَیں نے مالکن سے ایک بار کہا بھی تھا مگر انھوں نے جواب دیا کہ ابھی تو مہمانوں نے بھی نہیں کھایا ہے۔ تجھے پہلے ہی کھلا دوں کیا گھر سے بھوکا ہی آیا ہے۔"

کہا شکورہ نے بھی اپنے کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"آدمیوں کو ہلاک کرنے کے لئے طرح طرح کے زہر اور گھاتک ہتھیار بنا ڈالے ہیں مگر اس نقصان دہ جانور کو ختم کرنے کے لئے کوئی کامیاب قدم نہیں اٹھایا۔ پلیگ، طاعون، چیچک کا نام و نشان مٹانے والے اس کو بھی مٹا دیتے تو کتنا اچھا ہوتا۔"

"زنک فاسفیٹ چوہوں کو ختم کرنے کے لئے بنا تو دی ہے کوئی کسان اس کا استعمال نہ کرے تو سائنسدانوں کی کیا خطا ہے۔"

"یہ کچھ نہیں۔ اب چوہے ایسے ہو گئے ہیں کہ زنک فاسفیٹ کی بنی ہوئی گولیاں سونگھ کر بھاگ جاتے ہیں۔ کوئی ایسا زہر یا کھاد بنانا چاہئے تھا جس کو آبپاشی کے وقت پانی میں ملا دیا جاتا تا کہ بلوں میں بھر جاتا جس سے کوئی چوہا نہ بچتا۔"

"سائنسدانوں نے توجہ ہی نہیں دی ورنہ کچھ بھی غیر ممکن نہیں ہے۔"

"کیا کہا کچھ بھی غیر ممکن نہیں ہے؟ کیا اولوں کو بھی گرنے سے روکا جا سکتا ہے۔" شکورہ نے سوال کیا۔

"تو کھر یا ہلا تا رہ۔ یہ بھی ممکن ہے۔ سن میرا لڑکا سائنس پڑھتا ہے وہ بتایا کرتا ہے کہ تیز کرنوں سے موٹے سے موٹا تختہ پل بھر میں کاٹا جا سکتا ہے۔ ہر ستارے تک ان کرنوں کو بھیجا جا سکتا ہے اگر سائنسدان چاہیں تو ان کی مدد سے ایسی مشین بنا سکتے ہیں کہ جس کے اندر سے فوارہ کی کرنیں نکل کر آسمان میں بکھر جائیں اور اپنی گرمی سے بادلوں کے اس ماحول کو بدل دیں جس میں اولے تیار ہوتے ہیں۔ ہیروشیما اور ناگاساکی پر آگ برسانے والے اپنی طاقت کا استعمال ادھر بھی کر سکتے ہیں۔

"بھیکا تو تو شیخ چلی کی سی باتیں کرتا ہے بھلا خدائی میں دخل کون دے سکتا ہے۔"

"شکورہ ایک بات بتا۔ حضرت ایوب کا کوڑھ بنا دوا کے ٹھیک ہو گیا تھا۔ پیغمبر کے ایک انگلی اٹھانے سے چاند کے دو ٹکڑے ہو گئے تھے۔ حضرت یونس مچھلی کے

پیٹ سے زندہ سلامت نکل آئے تھے۔ کیا یہ خدائی کے خلاف نہیں ہے۔ جب یہ ہوسکتا ہے تو وہ کیوں نہیں ہوسکتا۔" بھیکا نے مدبرانہ انداز میں کہا۔

"ٹھیک ہے بھیکا علم سے سب کچھ ممکن ہے۔ آج بہت دیر ہوگئی اذان نہیں ہوئی۔" بات بدلتے ہوئے شکورہ نے کہا۔

ہو جائے گی اذان فکر کیوں کرتا ہے جب تک اذان نہ ہو تب تک تو جی لگا کر کام کر۔ اذان کی ٹوہ میں رہ کر کپاس کے پودے مت کاٹ دینا۔ خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بھیکا نے کہا۔

"نہیں بھائی مجھ سے کپاس نہیں کٹ سکتی میں بہت سنبھال کے کام کرتا ہوں۔" پھر بیڑی سلگاتے ہوئے شکورہ نے کہا۔

شکورہ تو بہت بیڑی پیتا ہے۔ یہ صحت خراب کرتی ہے اور جو صحت کو نقصان پہنچائے وہ سب سے بڑا دشمن ہوتا ہے اور کوئی اپنے دشمن سے محبت نہیں کرتا پھر تو اس کو منہ سے لگائے کیوں پھرتا ہے۔"

"بھیا کہہ تو ٹھیک رہے ہو سرکار نے بھی بات سگرٹوں کی ڈبیوں تک پر لکھوا دی ہے مگر یہ چھوٹتی ہی نہیں ہونے بھی کئی بار ٹوکا ہے۔"

"روزے رکھتے ہو؟"

"ہاں پورے روزے رکھتا ہوں!"

"تو پھر سارا دن کیسے رہتے ہو بنا بیڑی پیئے۔ اب جبکہ ایک ہی گھنٹے میں دو سلگا لیں۔"

"اس وقت تو نیت بنائی جاتی ہے۔"

"تم اسی طرح نیت بنا کے اس کو چھوڑ سکتے ہو۔ شروع شروع میں کچھ دقت ہوگی پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔ یہاں تک کہ بیڑی پینے والے بھی بُرے لگنے لگیں گے۔ مضبوط ارادے سے ہر کام آسان ہو جاتا ہے۔"

"تمہاری بات تو صحیح ہے مگر۔"

"مگر کیا اس بہانے کچھ آرام مل جاتا ہے۔ جتنا وقت ہندوستان کا مزدور بیکار گنواتا ہے اس طرح کسی بھی دیش کا مزدور وقت کا خون نہیں کرتا۔ بھارت کا مزدور تو دن پورا کرنے کی کوشش میں رہتا ہے۔ پانچ بجے اور کام چھوڑا۔ یہ نہیں سوچتا کہ اپنے فرض کو پوری طرح نبھائے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے مزدوروں کی غریبی ختم نہیں ہوتی۔ وہ چند گنتی کے سکوں میں زندگی کے بیش قیمتی دن بیچتا چلا جاتا ہے۔"

"کیا میں کام کم کرتا ہوں"۔ شکورہ نے تنک کر کہا

"جو کچھ کہہ رہا ہوں اسے اپنے ہی لئے کیوں سمجھ رہا ہے میں تو عام بات کہہ رہا ہوں۔ ایک دن میں نے پانچ مزدور ایکھ کھودنے کھیت میں بھیجے تھے۔ اور خود ہاؤس ٹیکس کے سلسلے میں کچہری چلا گیا۔ لوٹتے وقت دور سے دیکھا تو سب کھڑے گنے چوس رہے تھے۔"

"وہاں گنے کہاں سے آ گئے" شکورہ نے کپاس کے پودے کی جڑ میں سے گھاس کو چٹکی سے اکھاڑتے ہوئے تعجب سے کہا۔

"زمین میں بوئے ہوئے گنوں کو نکال نکال کے چوس ... رہے تھے۔"

"ان میں تو انکھوے نکل آتے ہیں۔"

میں نے بھی اُن کے پاس جا کر یہی کہا تو بولے جس پینڈے میں کوئی بھی انکھوا نہیں ہوتا اسے چوس لیتے ہیں، میں نے کہا تم کو کیا پتہ کہ زمین میں دبے ہوئے کون سے پینڈے میں انکھوے نہیں ہیں تو بولے کسی مارنے پر کم گہرے دبے پینڈے اُکھڑ آتے ہیں۔ ان کو دیکھ کر ہی تو دباتے ہیں۔ ان میں سے جو غلط ہوتا ہے اُسے چوس لیتے ہیں۔ اس کو دبانے سے کیا فائدہ وہ اُگے گا تو ہے نہیں۔ میں نے کہا کہ تم پانچوں کو ایک ہی ساتھ پینڈے کیسے مل گئے؟ تو بولے اکٹھے کرتے رہتے ہیں۔ اس طرح ان کی مکاری کا اندازہ لگا لیا اور دریافت کیا کہ کام کم کیوں ہوا ہے تو بولے ..... زمین سخت ہو گئی ہے کل کو کام زیادہ ہو جائے گا۔ یہ سن کر میں خاموش ہو گیا اور دل ہی دل میں سوچتا رہا کہ جب آج زمین کو سخت بتا رہے تو کل اور سخت ہو جائے گی جب زمین کی سختی کی وجہ سے آج کام کم ہوا ہے تو کل کو زیادہ کیسے ہو جائے گا۔

مَیں خاموش ہو رہا اور ان کے ساتھ کام پر لگ گیا اور اس راز کو سمجھنے کے لئے کل پر چھوڑ دیا۔ شام ہو گئی۔ سب لوگ چلے گئے۔ دوسرے دن مَیں جان بوجھ کر کچھ دیر سے گیا۔ کام سچ مچ اُمید سے زیادہ ہو گیا تھا۔ مَیں نے کھدی ہوئی گولوں کے درمیان زمین پر سے مٹی ہٹا کے دیکھا تو کہیں جگہ بغیر کھدی زمین پر مٹی بکھری ہوئی پائی۔ ان کو یہ عیب دکھایا تو بولے کہیں پودے کی جڑ کے آس پاس رہ گئی ہو گی۔ پینڈے اُکھڑنے کے ڈر سے کسّی دُور ماری ہو گی۔ اب ایسی غلطی نہیں ہو گی۔ اب مَیں اُن کی مکّاری اور چالاکی کو سمجھ گیا تھا۔ اگلے دن اُن کو کام پر نہیں بُلایا۔ یہ حال ہے ہندوستانی مزدوروں کا کیسے ترقی کر سکتے ہیں یہ لوگ اور کیسے یہ لوگ اور مُلک آگے بڑھ سکتے ہیں۔"

"ٹھیک کہتے ہو بھیا کہ تم آج دوپہر کھانا کھانے گھر نہیں گئے" بات کا پہلو بدلتے ہوئے شکورہ نے کہا۔

"ہاں بھیا آج کھانا کھانے گھر نہیں گیا صبح گُڑ اور چنے کھا کر آیا تھا۔ دوپہر کو کھانا خود بنانا پڑتا اس لئے نہیں گیا اب شام ہی کو بنا کر کھالوں گا یہ کپاس میری جان کو آ رہی ہے آج اس کی نرائی ہو جائے گی تو ایک بوجھ اُتر جائے گا۔"

"کیا تم دونوں میں لڑائی ہو گئی ہے جو کھانا خود بناتے ہو"۔ شکورہ بولا

"وہ لڑکے کے ساتھ مائکے گئی ہوئی ہے۔ وہاں کے زمیندار نے اپنا مکان چوکور کرنے کے خیال سے اس کے باپ کو اپنا گھر چھوڑنے پر مجبور کر دیا اور گاؤں کے کنارے بستی سے باہر اپنے باغ میں سے زمین دیدی ہے کچھ سامان اور کچھ روپے بھی دیدیئے ہیں مگر یہ امداد ناکافی تھی۔ زمیندار کا بول بالا ہے۔ دُنیا میں مُنہ دیکھا انصاف ہوتا ہے۔ غریب کی کوئی نہیں سنتا۔ بیچارے چُپ چاپ چھوڑ آئے۔ نہ بھی چھوڑتے تو کیا کرتے، خربوزے اور چُھری کا ساتھ تھا۔ ہر حال میں خربوزے ہی کا نقصان ہوتا ہے چاہے چُھری خربوزے پر گرے چاہے خربوزہ چُھری پر۔"

"بھیا کایوں مت کہو اللہ تعالےٰ کے یہاں سب کا انصاف ہوتا ہے۔"

"ہاں سُنتے تو یہی ہیں" کھڑے ہو کر منڈیر پر نظر ڈالتے ہوئے کہ کتنا کھیت باقی ہے

کر سیدھی کرتے ہوئے بھیکا نے کہا۔

"سنتے نہیں ہیں سچ ہے وہ ظالم اور مظلوم سب پر نظر رکھتا ہے تم دیکھنا یہ زمیندار ہی کسی دن غارت ہو جائیں گے ظلم زیادہ دن تک رنگ نہیں دکھاتا ہے۔" شکورہ نے کہا۔

"کہیں آگ لگتی ہے تو ہوا اس کی لپٹوں کو اور تیز کر دیتی ہے اسی طرح گاؤں کے لوگوں نے زمین دار کی ہاں میں ہاں ملائی۔ کسی خدا کے بندے نے یہ نہیں کہا کہ اس برسات میں اس کو مت نکالو تو اس کا نیا گھر پرانے جیسا بنا کر دے ہی دو مجبوراً آج سود پر روپے لے کر ان کی مدد کے لئے بہو کے ہاتھ بھیجے ہیں۔"

"اُس گاؤں کو چھوڑ کر اپنے گاؤں میں آ کر کیوں نہ بس گئے؟"

"کاشت کاری کی زمین کا کیا ہوتا؟"

"اُسے یہاں سے کرتے رہتے۔" شکورہ نے سمجھایا۔

"ایسا ہو تو سکتا تھا مگر زمیندار فصل کو اُجڑوا دیتا کیونکہ وہ اس طرح گاؤں سے چلے جانے پر چڑھ جاتا۔" بھیکا نے بات پوری کی۔

"ابا" پیچھے سے کسی لڑکی کی آواز آئی۔ دونوں نے مڑ کر دیکھا "کیوں بیٹی تو یہاں کیوں آئی ہے۔" شکورہ سے پہلے بھیکا نے کہا۔

"اماں نے بھیجا ہے کہ آج سات بج گئے لیکن ابا کام سے واپس نہیں آئے یہ معلوم کرنے آئی ہوں اور روز تو اذان ہوتے ہی چلے آتے تھے۔"

"ابھی اذان ہوئی ہی کہاں ہے بیٹی۔" شکورہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اذان تو کبھی کی ہو گئی آپ کو آواز نہیں آئی ہو گی کیوں کہ آج مسجد کا لاؤڈ اسپیکر خراب ہو گیا ہے وہ ابھی تک ٹھیک نہیں ہو پایا ہے۔ کوئی چیل پنجوں میں کہیں سے چوہا لے آئی تھی اور مسجد کے برج پر آ بیٹھی تھی چوہا اس سے چھوٹ کر نیچے گر گیا اور لاؤڈ اسپیکر کے تار کے پائپ میں گھس گیا پھر چیل کے ہاتھ وہ چوہا آیا ہی نہیں۔ تو وہ اُڑ گئی

خدا کو جب کسی کی جان بچانا ہوتی ہے تو ایسے بچاتا ہے وہاں چھپے ہوئے چوہے نے تار کو کُتر دیا اذان کے وقت اس کا بھید کھلا اب دوسری اذان تک وہ ٹھیک ہو پائے گا۔

"اللہ تعالیٰ کو یہ کام کرانا تھا بیٹی" یہ سُنتے ہی لڑکی خاموش ہوگئی اور گھر کو لوٹ گئی۔ بھیکا نے کہا "آج میری عبادت نے خوب کام کیا۔"

شکورہ اس راز کو نہ سمجھ سکا کہ بھیکا اپنی کس عبادت کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ وہ کُھرپا چلاتا رہا۔

سچّی عدالت

۱۸۵۷ء کے غدر میں حیدر بخش خاں نے کئی انگریزوں کی جانیں بچائی تھیں۔ جن کے بدلے میں انھیں ایک گاؤں انعام میں ملا تھا جس کا نام تن سکھیا پور تھا۔ کچھ دنوں بعد انھوں نے اس کا نام حیدر پور رکھ دیا۔

اسی حیدر پور میں ۱۹۰۲ میں چندن نامی ایک دھینور نے رات کے چار بجے اکیلے ہی گیارہ ڈاکوؤں کو جہنم رسید کر دیا۔ کہیں .... ڈاکہ ڈالنے کے بعد یہ ڈاکو ریلوے لائن سے ملحق کھڈ میں اس لئے چھپے بیٹھے تھے کہ وہاں سے گزرنے والی ریل گاڑی کی روشنی میں انھیں کوئی دیکھ نہ لے۔

چندن ریلوے کراسنگ پر آتی جاتی ریل گاڑیوں کو ہری اور لال جھنڈی دکھانے پر ملازم تھا۔ چنانچہ جونہی وہ آنے والی گاڑی کو ہری روشنی دکھانے کے لئے لالٹین لیکر چلا تو اُس نے کھڈ سے کھُسر پھُسر کی آوازیں سُنیں۔ ڈاکو مالِ غنیمت اچھا خاصا ملنے اور اپنی کامیابی پر خوشی کا اظہار کر رہے تھے۔

چندن ڈاکوؤں کی بات چیت کچھ لمحے تو سُنتا رہا۔ پھر اسے یکایک نہ جانے کیا سوجھی کہ گاڑی گزرنے کے فوراً ہی بعد لالٹین ایک طرف رکھ بلّم اٹھا کر اوپر ہی سے وار پر وار کرنے شروع کر دیئے جو اٹھتا اسے گرا دیتا جو سنبھلتا اسے پچھاڑ دیتا کیونکہ سب ڈاکو نیچاں میں تھے اور ایک کھڈ میں تھے۔ جو بھی بھاگنے یا مقابلے کے لئے کھڈ سے نکلنے کی کوشش کرتا اسی کے سر پر چندن کا بھرپور وار پڑتا اور بلّم ایک

آدھ ڈاکو کو ختم کر دیتی۔ کچھ ہی وقت میں سب ڈاکو اپنی کرنی کا پھل پا چکے تھے۔ جب کھڈ میں سے ڈاکوؤں کی مزاحمت ختم ہوگئی تو چندن نے لالٹین اٹھائی اور کھڈ میں جھانک کر دیکھا تو لالٹین کی روشنی میں اس نے دیکھا کہ سب کے سب مردہ پڑے ہیں تاہم اس نے بڑی چوکسی سے یہ اطمینان کر لیا کہ شاید ان میں سے کوئی دم سادھے پڑا ہو اور دھوکے سے اس پر وار نہ کرے۔ چندن کے اس غیر متوقع اور بہادرانہ اقدام کا چرچا چاروں طرف جنگل کی آگ کی طرح پھیل گیا۔ ان دنوں چھوٹے افسر بھی عام طور پر انگریز ہی ہوتے تھے۔ لہذا موقع کا معائنہ کرنے پی ڈبلیو آئی مسٹر جون برائٹ آئے ہر لاش سے خطرناک ہتھیار اور لوٹ کا مال برآمد ہوا۔

"ایک ہندوستانی نے گیارہ ڈاکوؤں کو مار دیا کمال کر دیا" مسٹر برائٹ کے دماغ میں رہ رہ کر چندن کی بہادری کا خیال آرہا تھا لہذا اس نے چندن کی کمر تھپکی اور دو ہزار پچیس روپے (چاندی کے) سرکار سے انعام میں دلوائے۔ اس واقعے کے بعد چندن اس علاقے کا ایک معتبر اور بہادر شخص سمجھا جانے لگا اس کی بہادری کے چرچے گھر گھر ہونے لگے۔ کچھ دنوں بعد چندن کی بہادری کے سبب لوگ حیدر پور کو چندن پور کہنے لگے۔ ہوتے ہوتے اس گاؤں کو سرکاری کاغذوں میں بھی چندن پور عرف حیدر پور لکھا جانے لگا۔ رفتہ رفتہ حیدر پور فراموش کر دیا گیا اور چندن پور ہی سرکاری طور پر۔۔۔۔۔۔۔ اس گاؤں کا نام تسلیم کر لیا گیا۔ وقت گزرتا گیا۔ چندن سنگھ کی لاڈلی بیٹی دیومینا کی دو لڑکیاں تھیں ایک انیتا دوسری نیتا۔ دونوں لڑکیاں وقت آنے پر الگ الگ گاؤں میں بیاہی گئیں۔

نیتا کے شوہر کے پاس گوہان کے بارہ بیگھے زمین تھی اور اس کے چار بچوں میں سے صرف ایک لڑکا دھرم سنگھ زندہ بچا تھا۔

انیتا کے شوہر کے پاس تینتیس بیگھے زمین تھی اور چودہ بچوں میں سے اس کا بھی نام لیوا صرف ایک ہی لڑکا درجن سنگھ زندہ رہا۔ درجن سنگھ دیہاتی ماحول کے باعث پڑھ لکھ نہ سکا لیکن انیتا جو ایک زمین دار کے یہاں برتن صاف کرتی تھی۔ اس نے وہاں کے

تعلیم یافتہ ماحول سے متاثر ہو کر اپنے لڑکے کو بی اے تک پڑھا دیا جو مہذب اور سمجھدار تھا۔ لہٰذا زمین دار نے اپنے اثر و رسوخ سے اس کو بینک میں نوکر کرا دیا۔ اور مالی کی خوبصورت معمولی تعلیم یافتہ لڑکی سے شادی بھی کرا دی۔ جہیز بھی مناسب ملا۔ اس طرح دھرم سنگھ خوش حال ہوتا چلا گیا۔

دُرجن ایک معمولی کسان ہی رہا۔ اس میں دیہاتی پن کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ دُرجن نے مچھلی کا کاروبار بھی کیا مگر اس کے باوجود اس کی ماں مالی حالت سے غیر مطمئن تھی لہٰذا بہن کی خوش حالی سے جلتی تھی۔ کبھی کبھی دل ہی دل میں اس کی ترقی پر جلتے ہوئے حقارت سے کہتی تھی "ایسی دولت، عزت اور ترقی سے بھی کیا فائدہ جو آبرو دے کر حاصل ہو جب کوئی بات نہیں ہے تو زمیندار نے دھرما کو پڑھایا کیوں۔ اس کی شادی کیوں کرائی بینک میں نوکری کیوں دلائی۔ شادی میں اپنی کار کیوں بھیجی۔ نیتا برتن ہی نہیں زمیندار کی ٹانگیں بھی ملتی ہوگی۔ ضرور کوئی بات ہے۔ اس زمانے میں کون بغیر مطلب کسی کا کوئی کام کرتا ہے۔ خاک پڑے ایسی ترقی پر۔" مگر اتنا کہنے پر بھی اس کے من کو سکون نہ ملتا اور وہ بہن اور بھانجے کی ترقی پر دل ہی دل میں کڑھتی رہی جس کے اثر سے اس کے چہرے پر بارہ بج گئے۔ جیسے پھانسی کا حکم مجرم کے چہرے پر صاف صاف دکھائی دینے لگتا ہے۔

ماں کی یہ مسلسل اداسی دُرجن سنگھ سے دیکھی نہ گئی اور بڑی مچھلیوں میں سے چھوٹی مچھلیوں کو الگ کرتے ہوئے اس نے ایک دن پوچھ ہی لیا "ماتا جی تم۔ میں کوئی تکلیف ہے کیا؟"

"کوئی تکلیف نہیں ہے بیٹا" ماں نے اصلیت کو چھپانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا۔ مگر حقیقت چھپائے نہیں چھپتی ہے ماں تمھیں کوئی نہ کوئی دُکھ ضرور ہے۔ دُرجن نے ماں کی گرتی ہوئی حالت سے اندازہ لگاتے ہوئے کہا۔ پتاجی کو گزرے ہوئے کئی سال ہو گئے مگر تم میں جو تبدیلی کچھ دنوں سے دیکھنے میں آ رہی ہے وہ پہلے کبھی نہیں دیکھی۔

"تیرے بیاہ کی چنتا ہے۔"

"اس چنتا میں تو میری صحت گرنی چاہیئے۔"

"پگلے" اندرونی جذبات کی اصلیت کو ایک کر کے نکالتے ہوئے ماں نے کہنا شروع کیا "بیٹا میں دن رات اس چنتا میں رہتی ہوں کہ دھرما سے تیری حالت کیسے اچھی ہو۔"

"ماں جو آگے نکل گیا وہ پچھڑے ہوئے کے ہاتھ کیسے آسکتا ہے۔"

"اگر خرگوش کو ہوش رہے تبھی تو اکثر لوگ ترقی کی منزل پر پہنچ کر غفلت کی نیند میں سو جاتے ہیں۔"

"ماتا جی دھرم مجھ سے کئی باتوں میں اتنا آگے ہے کہ میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔"

"یہ میں سب سمجھتی ہوں پھر بھی میں تجھے مالی حالت میں اس سے آگے نکال کر ہی مانوں گی۔"

"علاء الدین کا چراغ ہاتھ لگ گیا ہے کیا؟"

"تیری نانی کی ساری زمین تیرے نام کراؤں گی۔"

"وہ ترسٹھ بیگھے زمین میرے نام ہونے کے بعد میرے پاس چھیاسی بیگھے زمین ہو جائے گی یعنی میں چھیاسی ہزار روپے کی ملکیت کا مالک ہو جاؤں گا۔ مگر نانی جی کے ہوتے ہوئے یہ یک طرفہ فیصلہ ہوگا کیسے؟ کیا وہ ہم دونوں نواسوں کو برابر برابر نہ بانٹیں گی۔

"اسی اُدھیڑ بُن میں تو میں پریشان ہوں مگر یہ کام ہوگا اور اُس کے جیتے جی ہوگا۔ کچھ کام دھن سے ہوتے ہیں کچھ بل سے ہوتے ہیں کچھ دونوں سے نہیں ہوتے بلکہ عقل سے ہوتے ہیں۔"

"ذرا مجھے بھی تو بتایئے یہ کشمیر کا مسئلہ کیسے حل ہوگا۔"

"اُسے تحصیل میں مُردہ دکھادوں گی اور تمہارے نام جائیداد چڑھوا دوں گی۔"

"مَیں نے یہ سُن کر کچھ نہیں کہا اور شام تک پیٹ پر کپڑا باندھے کان دبائے کام کرتا رہا اس سے آگے کچھ کہتا تو شاید مار کھانی پڑتی یا نوکری سے ہاتھ دھونے پڑتے۔ میں نے نوکری کی سلامتی کے لئے سب کچھ گوارا کر لیا۔ ایک دن کھانا نہ ملنے پر مر تھوڑے ہی جاتا۔ کچھ ہو تو لاؤ ماتا جی مجھے بڑی بھوک لگی ہے۔" سیوا نے بے تکلفی سے کہا۔ جب کوئی سُننے والا ہوتا ہے تو دُکھیا کو دُکھ کا احساس بھی بڑھ جاتا ہے اور جب کوئی سننے والا نہیں ہوتا تو ضبط کا مادّہ بڑھ جاتا ہے یہ قدرتی بات ہے۔

"بیٹا تجھے بہت بھوک لگی ہے تو ایک کام کر پاس کے کھیت میں جا کر مٹر کی پھلیاں توڑ لا انھیں بھون بھون کر کھا لینا۔" سیوا کو یہ بات بہت پسند آئی اور وہ فوراً کسی کسان کے کھیت میں پھلیاں توڑنے چلا گیا۔ بھوک کی شدّت میں اس نے ماں کی اس رائے پر بحث بھی نہیں کی کہ جو ماں چوری کو بُرا بتاتی تھی آج کسی کے مٹر کے کھیت میں جا کر پھلیاں توڑنے کی رائے کیوں دے رہی ہے۔

ماں نے شیرے کا شربت گھول کر تیار کر لیا۔ تب تک سیوا پھلیاں توڑ لایا۔ وہ بھون لیں اور شربت کے ساتھ ثابت چبا چبا کر کھانے لگا۔ دانے نکالنے کی کسے فرصت تھی۔ ماں کچھ سوچ رہی تھی۔ وہ اُس کی سُستی دیکھ کر بولا "ماتا جی تم اُداس کیوں بیٹھی ہو۔ اس لئے کہ مَیں اکیلا کھانے لگا۔ تم سے پوچھا تک بھی نہیں۔"

"نہیں بیٹا۔ میں یہ نہیں سوچ رہی ہوں جو تم سوچ رہے ہو۔ دیکھو تم صُبح کو جب ساہو صاحب کے گھر جا رہے تھے تو مَیں نے کہا کہ رات کی دال روٹی رکھی ہے کھا جاؤ مگر وہاں کی پوڑیوں کی للک میں تم نے دن بھر کا فاقہ کر لیا نہ یہاں کھایا نہ وہاں۔"

"کیا وہ اب رکھی ہے۔"

"وہ تو مَیں نے اور تیری بہن نے کھا لی بیٹا" کہتے ہوئے ماں نے ایسا محسوس

"زندہ کو کیسے مُردہ ثابت کردو گی۔" سڑی ہوئی مچھلی کو کُتّے کے آگے پھینکتے ہوئے اس نے کہا۔

"گرام پردھان کی جیب گرم کر کے اس کے فوت ہونے کا سائٹی فکٹ بنوالوں گی اس کی بنا پر پٹواری، قانون گو، نائب تحصیل دار اور پھر تحصیل دار لکھ دیں گے۔ بس ہوگیا کام"۔

"تمہاری ترکیب تو ٹھیک ہے لیکن کسی نے نانی کو برسرِ عدالت کھڑا کر دیا تو کیا ہوگا"۔ مچھلی کو سوار سے الگ کرتے ہوئے اس نے کہا۔

"میں عدالت کو بتاؤں گی کہ دیوینا تو مرگئی ہے۔ یہ میرے باپ نے رکھیل رکھ لی تھی۔ دُرجن کی ماں جس کی لڑکی ہے وہ اس کی جائیداد کی قانونی وارث نہیں ہے۔ کوئی بھی جھوٹ ہو سو بار بولنے پر سچ ہو جاتا ہے"

"سوچ لو ماتاجی کام جوکھم کا ہے جھوٹ کو سچ ثابت کرنا وہ بھی عدالت میں معمولی کام نہیں ہوتا ہے۔"

"وہ عدالت بھگوان کی ہے دُنیا کی عدالت میں تو جھوٹ ہی کو سچ ثابت کیا جاتا ہے روز سینکڑوں کیس دیکھنے میں آتے ہیں۔ دیکھتے نہیں پولس ایک سو نو[۱۰۹] کے کتنے کیس عدالت میں بھیجتی ہے جب کہ ایک بھی کیس سچّا نہیں ہوتا ہے۔ کوئی قاتل کھُلے عام قتل نہیں کرتا چھُپ کر ہی مارتا ہے مگر چشم دید گواہوں کے بغیر ہر کیس جھوٹا ہوتا ہے جبکہ موقع پر شاذ و نادر ہی کوئی موجود ہوتا ہے یعنی گواہ زیادہ تر جھُوٹے ہوتے ہیں۔ پیسے میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ ترسٹھ ہزار کی زمین مل رہی ہے۔ اگر دس پانچ ہزار روپے اُوپر لگ جائیں تو کیا بات ہے۔ مَیں تمام لوگوں کو خرید لوُں گی۔ کوئی بات وہاں مشکل ہوتی ہے جہاں رشوت کو دخل نہ ہو۔ یہاں تو نوٹوں سے جیبیں بھر دو اور جو چاہو کرالو۔"

یہ سُن کر دُرجن چُپ ہوگیا۔ جیسے اس کو اپنی ماں کی اسکیم پر پورا پورا بھروسہ ہوگیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ لوگ چائے کی پیالی میں ایمان کو ڈبو دیتے ہیں۔ سگریٹ

میں اخلاق کو بھونک دیتے ہیں۔ پان میں زبان بگاڑ لیتے ہیں تو پھر کیا کچھ نہیں ہو سکتا۔ وقت کا پہیہ تک آگے بڑھتا گیا۔ انیتا نے جو سوچا تھا وہی کیا۔ مختیاری کے نوٹس تک تعمیل نہیں ہونے دیئے۔ سارا کام چپ چاپ ہو گیا۔ ایک دن دیوینا کو گائے نے لات ماردی۔ وہ پیچھے کھونٹے پر گر گئی اور کمر کی ہڈی ٹوٹ گئی جس سے اس کا اٹھنا بیٹھنا بھی مشکل ہو گیا۔ اب وہ پڑوسیوں کے رحم و کرم پر دن گزارنے لگی اور اسے اب زیادہ دن زندہ رہنے کی امید نہ رہی۔ سب پُن ہار کر کے اس نے گاؤں کے پردھان کو بُلا کر کہا۔

"بیٹا کسی وکیل کو بلا دے کیونکہ اب میرا آخری سمے قریب ہے۔"

"چاچی تم گھبراتی کیوں ہو تمہاری دو لڑکیاں ہیں دونوں اسے ہیں خوب سیوا کریں گے۔ علاج کرائیں گے ٹھیک ہو جاؤ گی۔ ہاری تھکی باتیں کیوں کرتی ہو چوٹ کس کے نہیں لگتی ہے۔"

"نہیں بیٹا مجھے زیادہ دنوں تک جینے کی امید نہیں ہے اور اب میں اپنی جائیداد کی وصیت کرنا چاہتی ہوں تاکہ بعد میں جھگڑا نہ ہو۔"

"چاچی تمہاری جائیداد تو انیتا نے اپنے لڑکے دُرجن کے نام کرا بھی لی ہے اب کاہے کی وصیت کرو گی۔" پردھان نے ساری داستان سنا دی۔ دیوینا یہ سُن کر چونکی اور کہنے لگی "مذاق کر رہے ہو۔"

"چاچی تم سے میں مذاق کروں گا؟ یہ سچ ہے۔"

"ہے بھگوان یہ کیا ہوا میرے جیتے جی انیتا نے مجھے مار دیا اور میری ساری جائیداد ہڑپ لی۔ مجھے معلوم بھی نہیں ہونے دیا۔ یہ کیسا انصاف ہے، کیسا قانون ہے، کیسی عدالت ہے، بھگوان نے بھی آنکھیں موند لیں کیا۔ اس کی عدالت تو سچی تھی یہ کیا ہوا کوئی بات نہیں میرے دل کو دکھانے والا بھی سکھی نہیں رہے گا۔ دُرجن کو یہ جائیداد پھلے گی نہیں۔ بے انصافی بے انصافی ہی ہوتی ہے یہ کبھی پھلتی نہیں ہے دھرم سنگھ کو بلوا دو" آنکھوں سے آنسو پونچھتے ہوئے دیوینا نے پردھان سے کہا "بہت اچھا

چاچی ابھی لو" کہتے ہوئے پردھان چلے گئے اور ایک نائی کے ہاتھ خبر بھجوادی۔ زمیندار کی کار میں بیٹھ کر نیتا دھرم سنگھ اور اس کی بہو آگئے۔ جس وقت تینوں آئے تو سب نے دیوینا کے بیر الگ الگ چھوئے۔ در اس نے مسکرا کے آشیرواد دی

"ماتا جی تم بیمار ہو جاتی ہو تو خبر کیوں نہیں کرتی ہو۔ کیا ہو گیا؟"

"خبر کر تو دی بیٹی کہ میری کمر ٹوٹ گئی ہے۔"

"کیسے؟" نیتا نے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا

"بھگوان کی بے انصافی سے۔"

"بھگوان کی بے انصافی سے تمھاری کمر ٹوٹ گئی میں سمجھی نہیں"۔ یہ سن کر ماں چپ رہی اور اصلیت ظاہر نہیں کی۔ جب ماں نے کچھ نہیں کہا تو نیتا پھر بولی "تم کو تکلیف ہو گئی تھی تو میرے گھر چلی آتیں یہیں کیوں پڑی رہیں۔ ہمارے ہوتے ہوئے تم اتنا دکھ اٹھاؤ تو دھتکار ہے ہمارے جیون پر تم نے ایسا کر کے لوگوں کو یہ کہنے کا موقع دیا کہ ماں باپ کی سیوا لڑکوں کے علاوہ کوئی نہیں کر سکتا۔"

"نہیں بیٹی تجھ پر کوئی انگلی نہیں اٹھا سکتا تو تو میرا خیال ہمیشہ سے رکھتی آئی ہے کئی بار پہلے بھی اپنے گھر لے چلنے کو کہہ چکی ہے۔ میں ہی نہیں گئی تھی کیونکہ تیرے گھر میرا رہنا اچھا نہیں لگتا ہے تو بیٹی میں ماں۔"

"ماتا جی تم پرانی باتوں کو مانتی چلی جاؤ، دنیا بہت آگے نکل چکی ہے۔ داماد تو بیٹے کے برابر ہوتا ہے اور بیٹے کے پاس رہنا کیا برا ہے۔"

"ٹھیک ہے بیٹی میں بھی کچھ نئی باتوں کو اپناؤں گی۔" مسکراتے ہوئے دیوینا نے کہا اور انیتا کی کرتوت سنا دی اور بولی "بیٹی میرے باپ مرتے وقت انگریز کے دیئے ہوئے انعام کے دو ہزار پچیس روپے مجھے دے گئے تھے۔ میں نے بہت سنبھال کے رکھے ہیں دودھ کی بڑوسی کے نیچے دبے ہوئے ہیں کھود کر نکال لو اور لے جاؤ۔ چاہتی تو یہ تھی کہ دونوں کو برابر بانٹتی مگر اس بے ایمان سے میرا دل پھٹ گیا ہے اور اب ان میں سے ایک روپیہ بھی اس کو نہیں دوں گی۔"

"ماں جی بدلے کی بھاونا کو تیاگ کر دونوں کو بلا لو اور روپیہ برابر برابر بانٹ دو۔ اس کی چالاکی اور مکاری اس کے ساتھ ہے۔ بھگوان اس کا انصاف کرے گا بندے کو اس کا قانون ہاتھ میں نہیں لینا چاہیئے۔"

"اچھا بیٹی تیری ہی بات بڑی سہی۔ کلونائی کو بھجوا کر اسے بھی بلوا لو"

انیتا خود تو نہیں آئی کیونکہ وہ ماں کے سامنے کس منہ سے آتی مگر اس نے اپنے لڑکے اور ایک بدمعاش کو اس کے ساتھ بھیج دیا جس نے مقدمے کے دوران اس کا ساتھ دیا تھا۔ دیونیا نے دھرم اور درجن کو پاس بٹھا کر کہا "میرے جیون بھر کی یہی پونجی ہے تم دونوں یہ روپیہ گن کر بانٹ لو۔" انیتا کے کالے کارناموں پر بغیر انگشت نمائی کئے دیونیا نے کہا "انھیں گننے کا کام دھرم بھائی کریں گے میں نہیں"۔ درجن نے کہا۔

"یہ مجھ سے بھی نہیں ہوگا۔" دھرم نے کہا۔

"تم دونوں نہیں کرو گے تو کلونائی تو محمدی بھٹیارن کو بلا لا وہ اس گاؤں میں سب سے زیادہ غریب ہے اس کام کو وہی ٹھیک کرے گی۔"

"بنیک کا کام بھٹیارن کو سونپا جا رہا ہے" کلونائی بولا

"ہاں بیٹا ایمان اور دھرم غریب ہی کے پاس رہتا ہے۔" بھٹیارن آئی اور روپے گن گن کر بیس بیس کی ڈھیریاں ترتیب سے لگا دیں تو دیونیا نے دھرم سنگھ سے کہا۔

"اس میں سے پچیس روپے اٹھا کر مجھے دے" یہ سن کر نائی، بھٹیارن اور وہ بدمعاش تینوں ہی چونکے۔ اس نے بہو کو اشارے سے بلایا اور ان روپیوں کو اس کے سر پر نچھاور کر کے بھٹیارن کو دیدیئے "لے بیٹی میرے ہنسوں کے اس جوڑے کو دعائیں دیتی ہوئی جانا۔"

بھٹیارن نے خوشی خوشی دامن پھیلا دیا اور روپے لے کر دعائیں دیتی ہوئی چلی گئی۔ دھرم سنگھ نے یہ دیکھ کر نائی سے کہا۔

"نانی جی اس میں سے آدھے روپے دُرجن کے اوپر نچھاور کرنے چاہئے تھے کیونکہ یہ بھی تو تمھارا نواسہ ہے۔"

"بیٹے دُرجن اور اس کی ماں کو میرے دھن کی ضرورت ہے اور نہ دُعا کی۔ دُرجن جا اندھیرا ہو رہا ہے۔" یہ سُن کر دُرجن نے دس سیر چاندی (ایک ہزار روپے) اُٹھائی اور روانہ ہوگیا۔ نانی نے دھرم سے پھر کہا "میری قمیص میں ایک نوٹ پڑا ہے ذرا نکالنا تو۔" یہ سُنتے ہی دھرم نے کھونٹی پر ٹنگی ہوئی قمیص کی جیب سے نوٹ نکال کر دیا۔ "کیا کرو گی؟" نانی سے پوچھا۔

"اس نائی نے میری بڑی خدمت کی ہے اس کو خالی ہاتھ تھوڑے ہی جانے دوں گی۔" یہ سنتے ہی دھرم سنگھ نے نوٹ پیچھے کھینچ لیا اور روپیوں کی ڈھیری میں سے پچیس روپے اُٹھا کر نانی پر سے نچھاور کر کے نائی کو دے دیئے۔ نانی کہتی ہی رہ گئی "کیا کر رہا ہے کیا کر رہا ہے۔" وہ نچھاور کرتا رہا اور کہتا رہا "ایسی نانی کسی کو بھی نصیب نہیں ہوگی۔ اس صدقے سے اور نائی کی دعا سے تم ٹھیک ہو جاؤ گی۔"

نائی روپے رومال میں باندھتے ہوئے بولا۔ "مہاراجہ ہو یا شہنشاہ نائی کے آگے سب کے سر جھک گئے۔ ایسے بھی لوگ ہیں جنھوں نے خدا کے آگے بھی سر نہیں جھکائے ہیں لیکن نائی کے آگے اُن کے بھی سر جھک گئے۔ غرض یہ کہ نائی کے آگے ہر ایک کا سر جھک جاتا ہے۔ آج میں آپ کے آگے سر جھکا کر اللہ سے آپ کی خوش حالی اور خوش اقبالی کی دعا کرتا ہوں۔" یہ کہتا ہوا نائی چلا گیا۔

"نانی جی آپ کو ہم اپنے ساتھ لے چلیں گے۔" دھرم بولا

"کیا کرو گے وہاں لے جا کے میری ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے اب میں جلدی مر جاؤں گی۔"

"اس زمانے میں مرنا اتنا آسان نہیں ہے" کہتا ہوا دھرم باہر کار کے ڈائیور

کو بُلانے چلا گیا اور چاروں نے مل کر چارپائی کار کے پاس لے گئے اور چارپائی سے اُٹھا کر دیونیا کو کار میں لٹا رہے تھے کہ نائی ہانپتا ہوا آیا۔

بابو جی غضب ہوگیا۔ درجن کے ساتھی نے اس کا قتل کر کے سارا روپیہ چھین لیا اور بھاگ گیا۔

دیونیا نے دھاڑ مارتے ہوئے کہا۔ غضب تو اس روز ہوا تھا جب درجن کی ماں نے جیتے جی مجھے مُردہ دکھا کر ساری جائیداد ہڑپ لی تھی۔ بھگوان کی عدالت واقعی سچی عدالت ہے۔

معصوم دشمن

"شرکان جی خزانچی من جیت سنگھ کا کوارٹر کون سا ہے؟" ایک لمبے ترنگے گورے چٹے سڈول جسم نوجوان نے مجھ سے پوچھا۔ صبح کا وقت تھا اور میں دروازہ پر بیٹھا داتن کر رہا تھا۔ میں نے ایک نظر نوجوان کو دیکھا اور ساتھ والے کوارٹر کی طرف ہاتھ سے اشارہ کر دیا۔ وہ آگے بڑھا اور زنجیر کھٹکھٹانے لگا۔ خزانچی صاحب نے دروازہ کھول دیا۔

"ست سری اکال" نوجوان کے منہ سے نکلا۔ خزانچی صاحب نے بھی "ست سری اکال" کہا اور اخلاقاً نوجوان کو اندر لے گئے۔

میں نے نوجوان کے لب ولہجہ سے سمجھ لیا تھا کہ یہ پنجابی نہیں ہے تو پھر کون ہے۔ میں جب سے یہاں آیا ہوں آج تک اس شخص کو نہیں دیکھا۔ میں نے دل ہی دل میں کچھ سوچا اور ان کی گفتگو سننے کے لئے دھیرے سے دروازے پر کان لگا کر کھڑا ہو گیا اندر سے دونوں کی آوازیں صاف صاف سنائی دے رہی تھیں۔

"کیا آج چھٹی ہے؟"

"نہیں صاحب کیسی چھٹی؟ یہاں تو مرنے تک کی فرصت نہیں ہے۔ صبح کے نکلے شام کو گھر آتے ہیں صرف اتوار کی چھٹی ملتی ہے سو گھریلو معاملوں میں ختم ہو جاتی ہے۔ نو ریسٹ ایٹ آل۔"

"مگر میں تو ابھی تک یہی سمجھ رہا تھا کہ آپ چھٹی پر ہیں۔"

"کیسے ؟"

"اس لئے کہ آپ پیوند لگی قمیض پہنے ہوئے ہیں۔ کام پر جانا ہوتا تو اچھی قمیض پہنے ہوئے نہ ہوتے۔ معمولی سے معمولی آدمی بھی جب کہیں باہر جاتا ہے تو کپڑے اچھے پہن لیتا ہے۔" اٹیچی پیروں کے پاس سرکاتے ہوئے نوجوان نے کہا۔

تمہارا اندازہ چاہے کچھ ہو مگر بات یہی ہے۔ کیا کروں بھائی ساڑھے چار سو روپے مہینہ ملتے ہیں۔ تین سیانی لڑکیاں ایک لڑکا میں اور میرے گھر میں کل ملا کر چھ پرانی ہو گئے۔ پیوند لگی قمیض نہ پہنوں تو کیا پہنوں۔ گن کے لینا گن کے دینا اوپر کی کچھ آمدنی نہیں ہے کیسے گھر کے اخراجات کو پورا کروں اور کیسے شان و شوکت سے رہوں۔"

دونوں باتیں کر رہے تھے۔ خزانچی صاحب کی لڑکی نے نمستے کرتے ہوئے چائے لاکر میز پر رکھدی اور اندر چلی گئی۔ نوجوان نے لڑکی کو پیچھے سے بغور دیکھا اور کہا "آپ کی بیٹی ہے ؟"

"جی ہاں، چائے پیجئے گا۔" خزانچی نے کہا

"شکریہ" انٹرویو میں بیٹھے کنڈیڈیٹ کی طرح کالر سنبھالتے ہوئے نوجوان بولا۔

"آپ کا شبھ نام کیا ہے بھائی جی ؟"

"میرا نام مالک رام ہے۔ امرتسر کا رہنے والا ہوں۔" فوراً ہی جواب دیتے ہوئے نوجوان نے کہا۔

"آپ جھوٹ بول رہے ہیں۔"

"کیسے ؟" نئی بٹی ہوئی رسّی کی طرح اینٹھتے ہوئے نوجوان بولا

"گھر امرتسر پنجاب میں ہے اور وہاں کے لوگوں کے بولنے کا یہ انداز ہی نہیں ہے۔ خیر جو بھی میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بتایئے۔" عاجزی سے خزانچی نے کہا۔ دونوں کی باتیں ہو رہی تھیں کہ میری لڑکی مینا کشی نے آواز دی "پاپا جی چائے

تیار ہے۔" یہ سُنتے ہی میں اپنے کوارٹر کی طرف چلا آیا۔ میری جاسوسی ادھوری رہ گئی تھی جس کا مجھے بہت دُکھ تھا۔ لیکن یہ سوچ کر میں مطمئن ہو گیا کہ مجھے کسی کے گھریلو معاملات سے کیا واسطہ۔

خزانچی صاحب کی لڑکی نیرو میری لڑکی کے ساتھ پڑھتی تھی۔ اگلے دن اس نے میری لڑکی کو بتایا کہ کل شام خزانچی صاحب کو سٹیشن پر نوٹوں سے بھری اٹیچی ملی۔ یہ سنسنی خیز خبر سُن کر میں خاموش رہا۔ مگر اندر ہی اندر اُس کی سچائی اور تصدیق کے لئے سوچتا رہا اور ایک دن میں نے خزانچی صاحب کو بازار میں روک کر اور بے ادبی کرتے ہوئے پوچھ ہی لیا۔

"خزانچی صاحب کیا یہ سچ ہے کہ آپ کو نوٹوں سے بھری اٹیچی ملی ہے؟"

"کسی اور سے مت کہہ دینا چاولہ جی ویسے یہ بات غلط نہیں ہے۔"

"تب تو یہ کہاوت سچ ہو گئی کہ بھگوان جسے دیتا ہے چھپر پھاڑ کر دیتا ہے۔ خزانچی صاحب میری برادری کے ہو بھلا میں تمہارا بُرا کیوں چاہوں گا۔" میں نے انھیں یقین دلایا اور وہ خوش خوش گھر چلے گئے اور میں بھی گھر آ کر گلی میں آندھی سے گرے پیڑ کے تنے پر بیٹھ کر سگریٹ کا دم لگاتے ہوئے سوچنے لگا۔

"کہیں خزانچی صاحب نے اس نوجوان کی اٹیچی کا صفایا نہ کر دیا ہو۔ اٹیچی تو اس نوجوان کے پاس بھی تھی۔ اور یہ بھی خیال بار بار آتا رہا کہ کسی کی جیب میں دس روپے ہوتے ہیں تو بھیڑ میں سے گزرتے وقت بار بار جیب پہ ہاتھ رکھ کر دیکھ لیتا ہے۔ کون ایسا لاپرواہ ہو گا جو نوٹوں سے بھری اٹیچی کو اس طرح بے پرواہی سے اسٹیشن پر چھوڑ جائے گا" اونہہ ہو گا مجھے کیا لینا دینا" کہتے ہوئے میں نے سگریٹ کے آخری حصّے کو پھینکا اور گھر کو چل دیا۔ ڈاکیا دروازے پر تار لئے کھڑا تھا "بھگوان خیر کرے" میں نے دھیرے سے کہا تھا مگر ڈاکیے نے سُن لیا اور بولا۔

بالکل کُشل ہے۔ بابوجی چنتا کی کوئی بات نہیں ہے۔" یہ سُن کر میں مسکرایا۔ دستخط کئے اور ٹیلی گرام کھول کر پڑھنے لگا۔ "رمیش گوٹ تھرو فرسٹ" میں اُچھل پڑا۔ "میرا لڑکا ایم بی بی ایس کے پہلے سال فرسٹ کلاس پاس ہوگیا" میں نے ڈاکیے کو فخر کے ساتھ سُنایا۔

"مبارک ہو بابوجی رمیش ہر سال اسی طرح پاس ہوا کرے اور میں اسی طرح خوشخبری کا تار لایا کروں۔"

"شکریہ۔ اور میں تم کو اسی طرح پانچ روپے مٹھائی کے دیا کروں۔" میں نے پانچ روپے کا نوٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ اس نے خوشی خوشی نوٹ جیب میں رکھا اور دُعائیں دیتا ہوا چلا گیا۔ اس خوشخبری سے گھر کے سب ممبروں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ مجھے فیکٹری کے کام سے لکھنؤ جانا تھا۔ گاڑی کا وقت سات بجے شام کا تھا۔ ریزرویشن پہلے ہی ہو چکا تھا۔ دوسرے دن لکھنؤ پہنچا۔ فیکٹری کا کام ختم کر کے آٹھویں دن گھر آیا تو جیسے ہی کپڑے اُتار نے اپنے کمرے میں پہنچا میری میز پر مٹھائی کا ڈبہ رکھا تھا۔ مجھے بھوک بھی لگ رہی تھی۔ مٹھائی تو ایسی چیز ہے کہ بغیر بھوک بھی کھالی جاتی ہے۔ جلدی جلدی کپڑے بدلے "مناکشی یہ ڈبہ کہاں سے آیا ہے۔" میں نے پوچھا

پاپا جی خزانچی صاحب کی لڑکی ایم بی بی ایس میں آگئی ہے اسی خوشی میں یہ مٹھائی دے گئی ہے" لڑکی نے کہا۔

"نیرو ایم بی بی ایس میں آگئی ہے؟ میں نے باون ہزار روپے ڈونیشن دیکر رمیش کو ایم بی بی ایس میں بھرتی کرایا تھا اور نیرو بنا خرچ ہی کیسے آگئی۔ خزانچی صاحب کا مقدر واقعی زوروں پر ہے۔ اُدھر نوٹوں سے بھری اٹیچی ملی اور لڑکی ڈاکٹری میں سلیکٹ ہوگئی۔ ایشور کی کرپا ہے۔"

"اور کیا بھگوان کی مایا تو ہے ہی" میری بیوی نے مختصر سا جواب دیا۔ میں خاموش رہا اور غسل خانہ میں چلا گیا۔ اسی سال میرا تبادلہ گورکھپور کا ہوگیا۔

کیا جیسے وہ دال روٹی کھا کر اس نے کوئی پاپ کیا ہو۔

"یہ تو اچھا کیا ماتا جی بھوک تو سبھی کو لگتی ہے۔ ماتا جی مجھے کیا پتہ تھا کہ یہ رئیس لوگ اتنے پتھر دل ہوتے ہیں۔ اتنے میں پھلیا بھی آگئی۔

"اچھا شادی سے لائے ہوئے مال کو اپنے لاڈلے کو چپ چاپ کھلا رہی ہو مجھے باہر کھیلنے کے لئے بھیج دیا۔ کیا مجھے بھوک نہیں لگتی ہے۔ کہتے ہوئے پھلیا نے بھیا کے آگے جھانکا۔" ارے مٹر کی پھلیاں اور شربت" وہ زور سے بولی۔

"کم بخت دھیرے سے بول کوئی سن نہ لے ہمارے کون سا مٹر کا کھیت ہے۔"

"ماتا جی شادی سے لائی ہوئی پوڑیاں اور کچوڑیاں کہاں گئیں" پھلیاں چباتے ہوئے پھلیا نے پوچھا۔

"بیٹی اسے کتا اٹھا کر لے گیا۔" اپنی بھوک پر قابو پاتے ہوئے ماں نے بات سانٹی اور سیوا چپ چاپ ماں کا منہ ٹکر ٹکر دیکھتا رہا۔

"تم جھوٹ بولتی ہو۔ اپنے لاڈلے کو کھلا دیں اور خود کھالیں میرے لئے کتا لے گیا۔"

پھلیا کا غصہ تیز ہوتا دیکھ کر سیوا نے ماں کی طرح سمجھایا۔

"میری ننھی سی بہن تو سچ مان لے ایسا ہی ہوا ہے۔ میرے ساتھ پھلیاں کھالے ورنہ یہ بھی نہ ملیں گی اور تو مجھ سے روٹھ رہی ہے میں تجھ سے روٹھ جاؤں گا۔ تیرے ساتھ کبھی بھی بیٹھ کر کھانا نہیں کھاؤں گا اور نہ تجھ سے کبھی بولوں گا۔"

پھلیا کو بھیا کی باتوں پر یقین نہ آیا وہ روتی ہی رہی اور روتے روتے سوگئی۔ جب رات کو تین بجے سیوا کو ایک تگڑی سی الٹی اور دست آیا۔ ماں نے پیٹ کی خرابی سمجھ کر اس پر کچھ دھیان نہ دیا۔ تھوڑی دیر بعد پھر الٹی اور دست آیا تو اس کو چناؤ میں ہارے ہوئے نیتا کی طرح اپنی غلطی کا دھیان

ایک برس بعد گورکھپور میں خزانچی صاحب کی دوسری لڑکی کی شادی کا دعوت نامہ ملا۔ لڑکی کا ہونے والا پتی جج تھا۔ یہ جان کر مجھے خوشی تو ہوئی لیکن تعجب خوشی سے زیادہ ہوا۔ ایک معمولی اوقات کا آدمی اتنا بڑا رشتہ ڈھونڈنے میں سپھل کیسے ہوگیا۔ لڑکیاں تو سُندر ہیں مگر آج کل کے لوگ حُسن کے ساتھ دولت بھی چاہتے ہیں۔ انھوں نے دولہا کی مانگیں کیسے پوری کی ہوں گی۔ اب مجھے یقین سا آگیا کہ انھیں نوٹوں سے بھری اٹیچی ضرور ملی ہوگی۔ میں نے اس شادی میں شرکت کا پُختہ ارادہ کر لیا تاکہ دیکھ سکوں کہ چاولہ صاحب کس شان سے شادی کرتے ہیں۔ تاریخ مقررہ پر مع اہل وعیال میں چاولہ صاحب کے یہاں پہنچا تو ان کے یہاں شادی کا منڈپ راجہ اندر کے اکھاڑے کو مات کر رہا تھا۔ ہر انتظام اعلیٰ تھا۔ حیرت کا مقام یہ تھا کہ خزانچی صاحب نے ایک عالیشان کوٹھی "کنور بھون" تعمیر کرالی تھی اور یہ شادی "کنور بھون" میں ہی ہو رہی تھی جو کہ انھوں نے اپنے لڑکے شیو کنور کے نام پر بنوائی تھی اور اس پر کئی لاکھ کے قریب لاگت آئی تھی۔ تین چار دن تک شادی کی گہما گہمی رہی۔ کسی بات میں کمی نہ دیکھی بلکہ شاہی شان شوکت ہی دیکھی۔ دولت کا مظاہرہ ہر طرف جلوہ گر تھا۔ یہ بھی پتہ چلا کہ لڑکے کے باپ کو اسّی ہزار روپے نقد دیئے گئے ہیں اور جہیز الگ ہے۔ جہیز تو ہم نے بھی دیکھا پچاس ساٹھ ہزار سے کم کا مال نہیں تھا۔ ہم لوگ گورکھپور لوٹ آئے لیکن یہ بات سمجھ میں نہ آتی تھی کہ خزانچی صاحب نے اتنا روپیہ کہاں سے کما لیا۔ اٹیچی کا مال بھی مان لیا جائے تو بھی اس میں نوٹ ہی ہوں گے اور وہ بھی گنتی ہی کے، قارون کا خزانہ تھوڑے ہی بھر رہا ہوگا جو ختم ہی نہیں ہوتا تھا اور نہ ہی کُبیر کا تھیلا تھا جس کی دولت خرچ کرنے پر بڑھتی چلی جاتی تھی۔

دوسرے سال انھوں نے دوسری لڑکی کی شادی ایک ایڈوکیٹ سے کی۔ دعوت نامہ اس شادی کا بھی آیا۔ خزانچی صاحب نہ جانے کیوں مجھ ایسے معمولی پڑوسی کو بھولے نہیں تھے۔ اکثر لوگ دولت مند ہونے کے بعد چھوٹوں کو بھول جاتے ہیں۔ مگر اس شادی میں ہم کسی گھریلو مجبوری کے باعث شریک نہ ہو سکے۔

اس کے ڈیڑھ سال بعد خزانچی صاحب کا ایک خط ملا جس میں انھوں نے اپنی لڑکی نیرو کی شادی جو ڈاکٹری میں پڑھ رہی تھی میرے لڑکے ڈاکٹر کرشن سروپ کے ساتھ کرنے کی تاجرانہ تجویز رکھی تھی۔ کئی روز تک میں اس پیشکش پر غور کرتا رہا۔ جب میں کسی نتیجہ پر نہیں پہنچا تو رائے لینے کے لئے وہ خط بیوی کو پڑھ کر سنا دیا۔ اس نے فوراً مسئلہ حل کرتے ہوئے کہا۔

"وہ پہلے کچھ بھی نہیں تھے لیکن اب تو رئیس ہیں، سماج میں عزت ہے۔ اُن کے رشتہ دار بھی اُونچے عہدے پر ہیں۔ لڑکیاں تو حوریں ہیں حوریں۔ اور پھر لڑکا ڈاکٹر ہے اور لڑکی بھی ڈاکٹرنی۔ اس شادی سے ہماری شان میں بٹا نہیں لگے گا فوراً خط لکھ دو کہ ہمیں یہ رشتہ خوشی سے منظور ہے۔ بیوی کی یہ بات مجھے بھی جچ گئی اور میں نے خط لکھ دیا۔ خزانچی صاحب میرا خط ملتے ہی فوراً آئے اور پچاس ہزار روپے سگائی کے شگن کے طور پر دے کر رشتہ طے کر گئے۔ اس کے بعد ہم اپنی زبان سے کیا مانگ سکتے تھے۔ ہمیں تو از خود انھوں نے امید سے کہیں زیادہ بھر دیا تھا۔ سگائی پر یہ حال ہے تو شادی پر کیا نہ کریں گے۔ اپنی طرف سے مانگ رکھ کر بات کیوں خراب کرتا۔ خزانچی صاحب بھی جہاں دیدہ تھے۔ آخر تک انتظار میں رہے کہ ہم لوگ کچھ کہیں۔ جب واپس جانے کو ہوئے اور ہم نے کچھ نہیں کہا تو خود ہی بولے "ڈیڑھ لاکھ اور خرچ کروں گا اگر آپ کو کچھ کہنا ہو تو ابھی کہہ سکتے ہیں۔" میں نے اُن کی بات سُن کر کہا۔

"جو کچھ بھی آپ دیں گے وہ سر ماتھے قبول کیا جائے گا۔ بھلے لوگوں میں مانگ تانگ شوبھا نہیں دیتی ہے"۔ وہ یہ سُن کر مسکرا دیئے اور چلے گئے۔ ہم لوگوں کو شادی اچھی ہونے کی اُمید تو تھی مگر اتنی اونچی شادی خواب میں بھی نہ تھی۔ شادی کا دن طے ہوا اور شادی ہو گئی اور سب کچھ ہماری اُمیدوں سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہوا۔

اس طرح خزانچی صاحب تینوں لڑکیوں کے بوجھ سے سبکدوش ہو گئے۔

صرف ایک لڑکا رہ گیا جو ذہین تھا اور پڑھنے میں ہوشیار اُس کو خزانچی صاحب چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ بنانا چاہتے تھے۔ بھگوان نے ان کا یہ خواب بھی پورا کر دیا اور اب وہ ریٹائر بھی ہو گئے تھے۔ شو کمار کا وواہ میرٹھ کے کسی ریڈی میڈ کلاتھ مرچنٹ کی لڑکی سے طے ہو گیا۔ اب کی بار اُنھوں نے مجھے شادی سے کئی دن پہلے شریک ہونے کی گزارش کی تھی جسے مَیں نے منظور کر لیا کیونکہ یہ میرا فرض تھا کہ ان کا اس موقع پر ساتھ بٹاؤں کیونکہ اب تو رشتہ داری کی بات تھی برادری یا دوستی کی رسمی بات نہیں۔

اُس وقت میری حیرت کا ٹھکانہ نہیں رہا۔ جب انھوں نے اپنے لڑکے کی دُلہن کے لئے پینسٹھ ہزار روپے کا سونا خریدا، مَیں ساتھ تھا۔ مَیں من ہی من میں سوچ رہا تھا کہ ان کے پاس اتنا روپیہ کہاں سے آ گیا جو ساون بھادوں کی برسات کی طرح ریل پیل ہو رہی ہے۔ مَیں نے بہت سوچا مگر کسی نتیجے پر نہیں پہنچا۔ اب اٹیچی والی بات بھی مشکوک نظر آنے لگی تھی۔ مَیں نے باتوں باتوں میں اُن سے پوچھ ہی لیا۔ خزانچی صاحب آپ پر لکشمی جی کی مہربانی کیسے ہوئی۔

خزانچی صاحب کچھ دیر خاموش رہ کر فرمانے لگے "سمدھی جی اب میں ریٹائر ہوں مجھے کسی کا ڈر نہیں ہے اور اب آپ بھی میرے اپنے ہیں چنانچہ آپ سے کیا چھپانا۔ اٹیچی کا تو ایک بہانا تھا، سوانگ تھا، ناٹک تھا جو ایک سجن نے مجھے سکھایا تھا بہت کائیاں تھا وہ۔ میری زندگی ہی بنا گیا گھر بیٹھے بٹھائے آدھکا اور بولا "میں تم کو ہر ہفتے بیس ہزار روپے دیا کروں گا ایک بٹہ چار میرے رہے باقی سب تمھارے۔ جعلی نوٹ اصلی نوٹوں میں ملا کر کسانوں کو گنے کی پیمنٹ کے وقت نکال دیا کرو۔"

اس کی یہ بات سُن کر پہلے تو میں اسے کوئی سی آئی ڈی والا سمجھا مگر بعد کو یقین ہو گیا کہ وہ ایک شاطر سمگلر تھا۔ مجھے اس کی یہ ترکیب پسند آئی اور مَیں نے ہاں کر دی۔

بس پھر کیا تھا، کام چل پڑا، چار ہفتے میں ساٹھ ہزار روپے کے نوٹ میری جیب میں آ جاتے۔ شروع شروع میں اس کام میں گھبراہٹ بھی ہوئی مگر

جس طرح کوئی نیک عورت غریبی سے مجبور ہو کر طوائف بننے سے گھبراتی ہے مگر بعد میں ڈھیٹ ہو جاتی ہے۔ اسی طرح بعد میں مجھے کوئی پریشانی نہیں ہوتی۔"

"اس طرح اپنے ذاتی مفاد کے لئے دیش کا بہت بڑا نقصان کیا۔"

"سمدھی صاحب مَیں اُن شریفوں سے رزیل ہی اچھا ہوں جن کے بچے دانے دانے کو محتاج ہوتے ہیں اور پھر بھی ان کی شرافت کی کوئی قدر نہیں ہوتی، کوئی عزت نہیں ہوتی۔"

مَیں نے حیرت سے خزانچی صاحب کے مُنہ کو کچھ دیر تک تکتے ہوئے کہا "ٹھیک ہے۔"

سِدّھی

"کیوں جی؟"

"کہیئے کیا بات ہے!"

دیکھو ریوت جب کسی چیز کی ضد کرتا تھا تو گانٹھ میں پیسہ نہ ہوتے ہوئے بھی کہیں نہ کہیں سے لاکر اس کی خواہش پوری کردی جاتی تھی۔ اور اسی بہانے ہمارا بھی مُنہ جُھوٹھا ہوجاتا تھا۔ جب سے اس نے سیٹھ کے گھر نوکری کرلی ہے تب سے تم نے تیوہار منانے بھی چھوڑ دیئے۔ صحیح بات ہے کہ گھر کی خوشی بچوں سے ہوتی ہے۔

"اے ہے۔ تیج تیوہار نہ منانے کی وجہ ریوت نہیں تم ہو۔ جب کوئی تیوہار آتا ہے تو کہہ دیتے ہو، للّا تو ہے نہیں، اچھا کھانا بناکر کیا کروگی۔ ریوت کے بنا تو میرے حلق سے اُترے گا نہیں۔ اسی طرح پورا سال بیت گیا تم نے کوئی تیوہار نہیں منانے دیا اور آج تم ہی یہ کہہ رہے ہو۔ چت بھی اپنی رکھتے ہو اور پٹ بھی اپنی۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو۔ ریوت کی ماں ہمارا تمھارا اچھا کھانا اور اچھا پہننا اوڑھنا بیکار ہے۔ بچوں کی خوشی میں ماں کی آتما خوش ہوجاتی ہے۔ سو ہمارا بچہ خوش ہے اب اسے کسی طرح کا کوئی دُکھ نہیں ہے۔ اب وہ ایسے گھر میں رہ رہا ہے کہ اسے ہر طرح کا آرام حاصل ہے۔ دو ایک بار تم نے اُس کے یہاں جاکر خود بھی اس کا رہن سہن دیکھا ہے کتنا خوش رہتا ہے اور تو اور اب تو اس کا رنگ بھی نکھر گیا ہے۔ پہلے سے

لمبا بھی ہوگیا ہے۔

"یہ تو ہے۔ دیوالی آنے والی ہے شاید اس تیوہار پر سیٹھ صاحب اس کو گھر آنے کی چھٹی دیدیں۔"

"ہاں وہ ضرور آئے گا۔ سیٹھ جی کیا سمجھتے نہیں کہ سال بھر ہوگیا ہے رایوت کو ان کے گھر رہتے ہوئے، تم نے ایک بات اور دیکھی۔

"کیا؟"

"اُس کی بولی بھی بدل گئی ہے۔ اَن پڑھ ہوتے ہوئے بھی وہ ایسے بولتا ہے جیسے پڑھے لکھے بولتے ہیں۔ تمھیں ماتا جی اور مجھے پتا جی کہتا تھا لیکن پچھلی بار تم نے دھیان دیا یا نہیں ممی ڈیڈی کہہ کر بول رہا تھا۔"

"ممی تو کچھ اچھا لگتا ہے مگر ڈیڈی تو بالکل اچھا نہیں لگتا۔"

"اونچے طبقے میں اب یہی فیشن ہے۔"

"خاک پڑے اس فیشن پر۔ ماتا جی پتا جی کہہ کر بولنے کی تو بات ہی اور ہے مجھے تو ایسے لوگوں کی بہت سی باتوں سے نفرت ہے۔"

"جیسے۔"

"تم نے دیکھا نہیں۔ ایک ہی میز پر لڑکا، لڑکی، بہو، ساس اور سسر کھانا کھا رہے تھے۔ لڑکے کی بہو سسر کے اتنے قریب بیٹھی تھی کہ منہ میں نوالا ڈالتے ہوئے جھکتے وقت اس کا گھٹنا بار بار سسر کے گھٹنوں سے بھڑ بھڑ جاتا تھا۔ کھلے سر ہنس ہنس کر باتیں بھی کرتی جاتی تھی اور کھانا بھی کھاتی جارہی تھی۔ یہ کوئی اچھی بات ہے۔ یہ بھی کیا فیشن ہوا جو چھوٹوں بڑوں کا ادب لحاظ بھی ختم کر دیا جائے۔"

"تم گھٹنے سے گھٹنا..... چھو جانے پر ہی برہم ہو رہی ہو۔ ابھی تم نے دیکھا ہی کیا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"یہی کہ جیسی باتیں تم کر رہی ہو یہ پچھڑے پن کی علامت سمجھی جاتی ہے۔"

"ماں مریادؤں کے ساتھ جینا پچھڑا پن ہوتا ہے کیا؟"

"ہاں مہذب لوگوں کا ایسا ہی خیال ہے۔"

"ریوت کی اماں ــــ" رتن کی بات ختم ہوتے ہی کسی نے دروازے پر آواز لگائی۔

ریوت کی ماں نے دروازہ کھولا اور باہر کھڑی جمنا سے کہنے لگی "ارے جمنا تم کیسے۔ آؤ اندر آؤ۔"

مقدم کے لڑکے کی شادی تھی نا اس کی بھاجی (جہیز میں لائی ہوئی مٹھائی جو گاؤں میں پرانی رسم کے مطابق گھر گھر تقسیم کی جاتی ہے) لائی ہوں" یہ کہتے ہوئے جمنا نے بارہ لڈو آگے بڑھا دیئے۔ ریوت کی ماں سکھو نے آنچل پھیلا کر لے لئے اور ماتھے لگا لئے۔ دولہا دلہن کو دعا دی اور ایک لپ اناج جمنا کو دے کر واپس کیا "لڈو کھالو" سکھو نے رتن (ریوت کے والد) کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

"یہ تو بارہ ہیں دیکھو ہمارے ریوت کا حصہ بھی بھیجا ہے اس کو بھولے نہیں حالانکہ وہ سال بھر سے یہاں نہیں ہے۔"

"بھلے آدمیوں کا دستور ہے کہ کسی کا حصہ نہ دینا اس کو کوسنا کہلاتا ہے۔"

"ٹھیک ہے چار تم کھالو چار میں کھالیتی ہوں اور چار ریوت کا حصہ رکھے رہیں گے۔ دیوالی میں اب کون سے زیادہ دن رہ گئے ہیں چار دنوں کی تو بات ہے۔ اگر چار دنوں میں خراب نہیں ہوں گے تو سب کو ہی رکھ دو اس کے آنے پر ہی کھالیں گے۔"

"ہاں اس کے بغیر لڈو تمہارے حلق سے کہاں اتریں گے؟ سکھو نے طنزیہ کہا اور لڈو رکھنے کمرے میں چلی گئی۔ لڈوؤں کا خالی لفافہ وہیں رکھ گئی۔ رتن اس ردی کے لفافے کو یونہی پڑھتے ہوئے مسکرایا۔ سکھو کمرے میں لڈو رکھ کر باہر

آئی تو رتن کو مسکراتے دیکھ کر پوچھا "مسکرا کیوں رہے ہو۔؟"

اس ردی کاغذ پر لکھا ہے (دس کروڑ کا یگیہ) بمبئی ۱۴ جنوری لکشن چیتنیہ برہمچاری عرف کاشی جی مہاراج سنت اس سال کے دوران راج کوٹ میں چنڈی مہایگیہ کریں گے۔ اس یگیہ پر دس کروڑ روپیہ خرچ ہوگا۔ برہمچاری جی نے نامہ نگاروں کو بتایا ہے کہ سوا لاکھ براہمن گیارہ ہزار کنڈوں میں اکیس دن تک لگاتار سمدھا دیتے ہوئے یگیہ سمپن کریں گے۔ یہ یگیہ عالمی امن اور قومی یکجہتی کے لئے ہوگا۔ سنت نے یقین ظاہر کیا ہے کہ وہ ایشور کی کرپا سے اتنا دھن اکٹھا کرلیں گے۔

"اتنی بڑی رقم آگ میں جھونک دی جائے گی کیا اس طرح شانتی اور ایکتا کو بڑھاوا ملے گا؟"

"شانتی ایکتا کو بڑھاوا ملے نہ ملے لیکن لوگوں کے دلوں میں یہ بات ضرور آئے گی کہ عالمی امن کا ڈھنڈورا پیٹنے والے امریکہ سے تو یہ سنت لاکھ درجے اچھے ہیں جو عالمی امن کے لئے شانتی یگیہ کر رہا ہے اور امریکہ ویت نام میں ایک فوجی سپاہی کو گولی کا نشانہ بنانے کے لئے تین لاکھ چوالیس ہزار آٹھ سو ستائیس روپے خرچ کرتا تھا۔

"ممی جی" کسی نے زور سے دروازے پر آواز لگائی اور دونوں نے باتوں کا سلسلہ توڑ کر دروازے کی طرف دیکھا "یہ تو ریوت کی آواز ہے" ہنستی ہوئی سکھو دروازہ کھولنے گئی۔ کواڑ کھلتے ہی "ممی جی نمستے" ریوت کو سکھو نے سینے سے لگا لیا پیار سے سر پر ہاتھ پھیرا دعائیں دیں اور اندر لے آئی۔ "دیکھو ہمارا بیٹا آگیا۔ اب کی دیوالی خوب شان سے منائیں گے۔"

"ہاں ہاں شان سے منائیں گے۔ آؤ بیٹا بیٹھو۔" پاس بٹھاتے ہوئے رتن نے کہا۔ "تمہاری بڑی عمر ہے بیٹا ابھی ابھی تم کو یاد کر رہے تھے ایک بات بتاؤ۔؟"

"پوچھیے۔"

THIS EBOOK IS DOWNLOADED FROM
SHAAHISHAYARI.COM

LARGEST COLLECTION OF URDU
SHERS, GHAZALS, NAZMS AND EBOOKS.

"تم موٹے تازے کیوں نہیں ہو؟"

"تم بھی کمال کی باتیں کرتے ہو۔ بھلا پرائے گھر اپنے گھر جیسے سکھ اپنے گھر جیسی آزادی تھوڑے ہی ہوتی ہے۔" سکھو نے بات کاٹ کر کہا۔

"نہیں ممی جی ایسا مت کہو میں سب کچھ سن سکتا ہوں مگر سیٹھ صاحب کی برائی نہیں سن سکتا وہ تو دیوتا ہیں دیوتا مجھے اپنے بچوں کی طرح رکھتے ہیں کبھی کبھار کوئی نقصان بھی ہو جاتا ہے تو بھی نہیں ڈانٹتے اور کسی دوسرے کو بھی نہیں ڈانٹنے دیتے۔ کہتے ہیں نقصان سب سے ہوتا ہے، بچہ ہے سیکھتے سیکھتے سب سیکھ جائے گا۔"

"بیٹا جب تم ان کی اتنی تعریف کرتے ہو تو پھر تمہاری صحت کمزور کیوں ہے؟"

"آپ کا یہ خیال صحیح ہے ڈیڈی کہ میں موٹا تازہ نہیں ہوں مگر کسی کے دبلے پتلے ہونے کا کارن کھانے پینے کی کمی ہی نہیں ہو سکتی ہے کوئی اور بات بھی تو ہو سکتی ہے۔" جھولا ماں کی طرف بڑھاتے ہوئے ریوت کچھ اس طرح ٹھٹھکا جیسے کوئی طالب علم امتحان کے وقت کچھ سوچنے بیٹھ جاتا ہے۔ ماں نے جھولے میں جھانک کر دیکھا "ارے اس میں تو لڈو ہیں۔"

"ہاں ممی اس میں بارہ لڈو ہیں۔ سیٹھ صاحب نے دیئے تھے۔ کہا تھا کہ گھر کو جا رہا ہے خالی ہاتھ جانا ٹھیک نہیں ہے سال کے بعد گھر جا رہا ہے۔"

تب تو سچ مچ سیٹھ جی ایک اچھے آدمی ہیں۔ ورنہ عام مالکوں میں ایسی باتیں دیکھنے میں نہیں آتی ہیں مگر بیٹا ایسا کیا غم ہے۔ یا کون سا کلیش تجھے گھلائے دے رہا ہے۔ ہمدردی سے ماں نے کہا۔ یہ سن کر ریوت کہنے لگا۔ ممی جی میں ایسا کیوں ہوں سنو سیٹھ صاحب کے ہاں ایک بہت خوفناک السیشین کتا ہے۔ جتنا خرچ وہ اس کتے پر کرتے ہیں اتنے میں ایک خاندان پل سکتا ہے۔ جاڑوں کے دنوں میں وہ ایک بڑھیا گدے پر سوتا ہے اور روز شام کو روئی کی جاکٹ اس کو پہنائی جاتی ہے۔

آیا اور مرچیا گندھ لا کر آوٹا کر اس کا پانی پلایا مگر کچھ نتیجہ نہ نکلا۔ دست پر دست آتے گئے۔ آخر میں اس نے ڈاکٹر بُلانے کی سوچی لیکن گھر میں کانی کوڑی بھی نہ تھی۔ اس کا خرچہ کیسے برداشت کرتی۔ اچانک اس کا ہاتھ کانوں میں پڑی چاندی کی بالیوں پر گیا جو سیوا کے باپ کی موت کے بعد اس کے کانوں میں باقی رہ گئی تھیں۔ انھیں کو لے کر وہ ساہو صاحب کے گھر پہنچی۔ "تم کون ہو؟" گھونگھٹ کاڑھے ہوئے سیوا کی ماں سے ساہو صاحب کے لڑکے نے پوچھا۔

"ساہو صاحب مَیں سیوا کی ماں ہوں جو تمہارا سیوک ہے۔"

"مگر وہ ابھی تک آیا کیوں نہیں؟ سر سے اونچا کام ہے۔"

"پُوت یہ تو میں بھی جانتی ہوں مگر کیا کروں وہ بیمار ہے۔"

"اس کا یہ مطلب کہ تم اس کے لئے چھٹی مانگنے آئی ہو۔ چھٹی کے لئے اس سے اچھا اور کوئی بہانہ نہیں ہو سکتا۔" اپنے ہاتھ کا کنگن سنبھالتے ہوئے دُولہے نے کہا۔

"بیٹا کوئی ماں اپنے اچھے بیٹے کو بیمار نہیں بتا سکتی۔" کانوں کی بالیاں ہاتھ میں اُلٹ پلٹ کرتے ہوئے ماں نے پھر کہا۔ "مَیں انھیں رکھنے آئی ہوں، کیونکہ دوا دارُو کو پیسے نہیں ہیں۔ آج کا کام چلا دو، بڑا پُن کماؤ گے۔" رِریاتے ہوئے اُس نے عاجزی سے کہا۔ بالیاں لے کر دُولہا اپنے پِتا کے پاس پہنچا اور اس کی مجبوری کا حوالہ دیتے ہوئے بولا۔

"پتاجی اس پر کچھ روپے دیدو۔"

"یہ شادی کا دن ہے آج دُکانداری کا کوئی کام نہیں ہوگا۔"

"مگر پتاجی اس کا تو لڑکا بیمار ہے۔ جیسے بھی ہو اس کا کام تو کرنا ہی پڑے گا۔" ایک نظر سیوا کی ماں کی طرف ڈالتے ہوئے دُولہا بولا۔

"تیری جاننے والی معلوم ہوتی ہے؟" چشمہ اُتارتے ہوئے ساہو صاحب

دوسرے تیسرے دن اس کی صفائی کی جاتی ہے۔ جب میں اس کے ٹھاٹ باٹ دیکھتا ہوں تو مجھے تمھارے اس لحاف کی یاد آجاتی ہے جس کو اوڑھتے ہوئے نہ جانے کتنی سردیاں بتا دی ہیں۔ یہ گھٹن یہ فکر مجھے کیسے موٹا ہونے دے گا۔ ایک دھنی کا حیوان نردھن انسان سے اچھی طرح بسر اوقات کرے یہ غم مجھے رات بھر رُلاتا رہتا ہے۔ ممی کبھی بھگوان کو بُرا بھلا کہتا ہوں اور کبھی اپنے بھاگیہ کو کوستا ہوں۔

وہ کُتا روز صبح دودھ اور بسکٹ کھاتا ہے۔ دوپہر کو گوشت اور روٹی کھاتا ہے۔ ایک ہم ہیں کہ ایک وقت بھی خشک روٹی اور چٹنی مل جاتی ہے تو بھگوان کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتے ہیں۔ اس کُتے کا مزاج دیکھو ممی اگر سیب بغیر چھیلے دیا جائے تو سُونگھ کر چھوڑ دیتا ہے اور زبان کے چٹخارے کو اتنا سمجھتا ہے کہ کیا مجال جو کوئی اسے کوئی پھیکا خربوزہ کھلا دے۔ اتنا سدھا ہوا ہے کہ مالکن کے چٹکی بجاتے ہی دونوں ٹانگیں کندھے پر رکھ کر بال چاٹنے لگتا ہے جیسے دو بچھڑے دوست ملتے ہیں۔ اگر یہ سب کچھ میں اپنی آنکھوں نہ دیکھتا تو ان باتوں پر کبھی یقین نہ کرتا۔

"ممی تم پیسے پیسے کو تنگ رہتی ہو لیکن ان کے ہاں نوٹ بوریوں میں بھر کر آتے ہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"شام کو دکان کی بکری بوری میں بھر کر آتی ہے اور بہو بچوں کے سامنے لا کر لوٹ دی جاتی ہے۔ وہ سب مل کر نوٹوں کو الگ الگ کر کے ربڑ کے چھلوں میں باندھ دیتے ہیں۔ نوٹوں کی گنتی تک نہیں کی جاتی کہ کون وقت برباد کرے۔"

"ڈیڈی دیکھو بھگوان کا انصاف کہ ایک کے پاس خرچ کرنے کو پیسے نہیں اور دوسرے کے پاس نوٹ گننے کا وقت نہیں۔ بھگوان کی یہ بے انصافی مجھے ہر وقت اکھرتی رہتی ہے۔ میرے جسم پر چیونٹیوں کی طرح کاٹتی رہتی ہے۔"

ایک دن کی بات ہے کہ زور کی بارش ہوئی اور اولے بھی پڑے۔ سیٹھ صاحب کے بچے خوشی میں اُچھلنے کودنے لگے اور اولے اُٹھا اُٹھا کر چبانے لگے۔ اور بڑے بڑے اولے پڑنے کی دعا مانگ رہے تھے۔ سیٹھ صاحب ان بچوں کو دیکھ کر خوش ہو رہے تھے اور مَیں ایک طرف حیران کھڑا تھا۔ اگر مَیں تمہارے سامنے ایسے کرتا تو تم میری چڑی اُدھیڑ دیتے۔ کسان اولے پڑنے پر دُکھی ہوتا ہے اور بھگوان کے حضور ہاتھ جوڑتا ہے کہ اولے بند ہو جائیں مگر سیٹھ کے ہاں اُلٹا ہی دیکھا۔ مجھے حیران دیکھ کر سیٹھ صاحب بولے "ارے تو بھی اُچھل کود، اولے کھا اور بچوں کے ساتھ مستی لے۔"

"مَیں تو روٹی کھا کر اچھلتا ہوں اولے کھا کر نہیں۔" مَیں نے سیٹھ صاحب سے کہا وہ ایک دم چُپ ہو گئے۔ مَیں کچھ اور بھی کہتا مگر ان کے گمبھیر چہرے کو دیکھ کر چُپ ہو گیا۔

"بیٹے اولے پڑنے میں کسانوں کا نقصان ہوتا ہے۔ وہ دُکھی ہوتے ہیں۔ رئیسوں کا اولوں میں کون سا نقصان ہوتا ہے جو وہ دُکھی ہوں۔

مگر کھاتے تو وہ بھی روٹی ہی ہیں جو اناج سے بنتی ہے اور اناج کھیتوں میں اُگتا ہے۔

"وہ رئیس ہی کیا جو اِن باتوں کو سوچے اس کو تو صرف اپنی تجوری کا دھیان رہتا ہے کہ وہ خالی ہے یا بھری"، سکھو بولی۔

"اب ہم سمجھ گئے بیٹا کہ اتنے بڑے گھر میں رہ کر بھی تُو خوش کیوں نہیں ہے۔ ارے پگلے اب ہم پہلے کی طرح دُکھی نہیں ہیں۔"

"کیسے؟"

"مَیں نے اب دیوی کی سِدّھی کر لی ہے۔ جو بھی ضرورت ہوتی ہے اس سے منگا لیتا ہوں۔ اب تو ہماری مصیبتوں، پریشانیوں اور دقتوں کو سوچ سوچ کر کُڑھنا چھوڑ دے۔"

"سدھی کا چمتکار تجھے بھی دکھاؤ تو میں بھی جانوں۔"

"اچھا ابھی لے دیکھ تو بارہ لڈو دلایا ہے میں ان کو چوبیس یعنی دوگنے کرتا ہوں، یوں کہہ کے رتن اس کے جھولے کو اندر لے گیا۔ اور پہلے والے لڈو اس میں ملا کر لے آیا۔ "لے گن لے چوبیس ہیں یا نہیں۔"

"بس تو بیٹا اب تو ہماری چنتا چھوڑ کر سُکھ سے رہا کر۔ اب ہم کو کوئی تکلیف نہیں ہے۔"

یہ سنتے ہی تُوؤں سے مرجھائی کھیتی پر بارش کے بعد آئی چمک کی طرح ریوت کا چہرہ کھِل اُٹھا۔

پُنر وواہ

۶ جون سنہ ۱۹۸۱ء کو جب دوپہر بعد سمستی پور کے پاس بلّا گھاٹ اور دھنبارا گھاٹ اسٹیشنوں کے درمیان سمستی پور بنمکھی ایکسپریس کے سات ڈبے کئی سو مسافروں سمیت (جن میں سات براتیں بھی تھیں) لائن پر سامنے سے آتی ہوئی بھینس کی جان بچانے کی ناکام کوشش میں تیز رفتار ٹرین کی ایمرجنسی بریک استعمال میں لانے کے باعث گاڑی اُچھل کر پُل سے نیچے پھنپھناتی ہوئی اتھاہ گہری کوسی ندی میں ڈوب گئے۔ اسی دن المورا ضلع میں پلاشاٹ پٹی کے بھنی گاؤں میں ایک پہاڑی عورت جوگلی دیوی نے غُلیل سے دھان کے کھیت میں دانہ چُگ رہے جنگلی تیتروں میں سے ایک تیتر مار گرایا تو وہ اپنے اچوک نشانے پر خوشی سے پھولے نہیں سما رہی تھی۔

تیتروں کا جُھنڈ کا جُھنڈ آتا اور دھان کے کھیتوں پر حملہ آور ہو کر نقصان کرتا ہوا اپنی راہ لیتا۔ جوگلی دیوی روز صُبح شام ان تیتروں کو اُڑانے پر لگی ہوئی تھی۔ تیتروں کو اُڑانے میں چیختے چیختے جب اس کی آواز بلیٹھ گئی تو اس نے غُلیل کا استعمال کرنا شروع کر دیا۔ ویسے وہ بڑی رحم دل تھی اور اس نے کبھی کسی تیتر کو جان سے مارنے کا سوچا بھی نہ تھا۔ وہ دانستہ ایسے زاویے سے غُلہ پھینکتی کہ کسی تیتر کے لگنے کے بجائے کھیت میں گرتا اور اس کی آواز سے تیتر اُڑ جاتے مگر اس کے باوجود غیر ارادی طور پر آج اس کی غُلیل سے نکلے ہوئے غُلہ نے ایک تیتر کی جان لے ہی لی تھی۔ زخمی تیتر گرم گھاؤ میں تیزی سے اُڑتا ہوا سڑک کے دوسرے کنارے پر جا گرا۔ اس کے

جسم سے نکلتی ہوئی خون کی بوندیں سڑک پر اس کی شہادت کا انتہاس لکھ رہی تھیں کہ ایک فاریسٹ گارڈ اُدھر آنکلا۔ ننھے فارسٹ گارڈ جو خود بھی دل ہی دل میں جوگلی دیوی کے تیرِ نظر کا زخم خوردہ تھا۔ کڑک کر بولا۔

"جوگلی دیوی تم نے جنگلی تیتر مارا ہے۔ اور یہ سرکاری قانون کے خلاف ہے تم جانتی ہو اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ ننھے جاں بلب تیتر کو اُٹھائے جوگلی کے قریب پہنچ گیا اور سرکاری قانون کی تشریح کرتے ہوئے اسے خوف زدہ کرنے کی پوری کوشش کرنے لگا۔

"تیتر جنگلی ضرور ہے مگر میں نے اس کو اپنے کھیت میں مارا ہے۔ جنگل میں نہیں تو پھر قانون کو کیسے توڑا ہے۔"

"میں نے اس کو اپنی حد سے اُٹھایا ہے سڑک پر پڑے اس کے خون کے دھبے اس کا ثبوت دیتے ہیں کہ تم نے اس کو کہاں مارا ہے۔ چلو رینجر صاحب کے پاس۔"

"چلو" جوگلی اکڑ کر بولی۔ کیونکہ وہ سچی تھی اور خطاوار بھی نہیں اس لئے اس نے ہمت نہیں ہاری اور بے دھڑک چلدی کیوں کہ اسے یقین تھا کہ رینجر صاحب اس کی سچائی پر یقین کر کے اسے معاف کر دیں گے۔ چلتے چلتے گارڈ بولا۔

"جوگلی دیوی تجھے معلوم ہے ایک تیتر مارنے پر کتنا جرمانہ ہو سکتا ہے۔"

"میں نہیں جانتی" بے پرواہی سے اس نے جواب دیا۔

"پرسوں ایک ٹرک سے ایک گوئے کچلی گئی تھی جو ایک معمولی سے جانور نیولے یا بس کھپرے کی نسل کی ہوتی ہے مگر رینجر صاحب نے ڈرائیور پر بتیس ۳۲ سو روپے جرمانہ کیا۔ تیتر کے مارنے پر بھی ہزار بارہ سو روپے جرمانہ ہو سکتے ہیں۔

"کوئی ترکیب ایسی بھی ہے جو تم مجھے اس مصیبت سے بچا دو وہاں مجھ پر جو کچھ جرمانہ ہوگا اس میں سے تم کو تو کچھ ملنے گا نہیں۔ سب سرکاری خزانے میں جمع ہو جائے گا اس لئے تم ہی سو دو سو روپے مجھ سے لے لینا اور مجھے جانے دو"

جوگلی دیوی نے بچے کو گود میں سنبھالتے ہوئے کہا۔ جوگلی دیوی کی رحم بھری اس درخواست سے گارڈ کو اپنے دلی ارمان پوری ہونے کی جھلک دکھائی دینے لگی تو مسکراتے ہوئے بولا۔

"تم مجھے روپیہ پیسہ ہرگز مت دو۔ صرف میرے تھڑے پر ایک رات کے لئے آجاؤ۔"

"یعنی چند ٹکوں کو بچانے کے لئے اپنی آبرو لٹا دوں۔ میں تو ودھوا ہوں تمہیں مجھ سے اس طرح کی بات بھی نہیں کرنی چاہیئے۔ میں جرمانہ ادا کروں گی۔ لیکن یہ پاپ کبھی نہیں کروں گی۔ جوگلی یہ کہتے ہوئے رینجر کے بنگلے کی طرف بڑھی۔

گارڈ نے رینجر صاحب کے بنگلے پر پہنچ کر واقعہ کچھ اس ڈھنگ سے سنایا کہ جوگلی پر جرمانہ کیا جانا ضروری ہوگیا۔ جوگلی دیوی نے بارہا کہا "یہ گارڈ جھوٹ بول رہا ہے"۔ مگر رینجر صاحب پر ایسا رنگ چڑھایا گیا تھا کہ اس نے جوگلی کی کوئی بات بھی صحیح نہ مانی اور کہا "تم سرکاری آدمی کو جھوٹا بتا رہی ہو اور خود مجرم ہو۔ یہ قدرتی بات ہے کہ مجرم اپنا جرم کبھی قبول نہیں کرتا بلکہ اپنے بچاؤ کے لئے طرح طرح کی باتیں بناتا ہے چونکہ تم نے سنگین جرم کیا ہے لہٰذا میں تم پر بارہ سو روپے جرمانہ کرتا ہوں اور جب تک یہ رقم ادا نہیں ہو جاتی تب تک تم ہماری حراست میں رہو گی۔"

یہ حکم سنانے کے بعد رینجر صاحب کاغذی کارروائی پوری کرنے لگے۔ جوگلی دیوی نے بچے کو اپنے سینے سے اس طرح لگایا کہ اگر جرمانہ ادا نہ ہوا اور جیل جانا پڑا تو بچے کو نہیں چھوڑے گی۔ گارڈ جوگلی کو دیکھ دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ مگر کچھ ہی لمحات بعد ننھے گارڈ کی مسکراہٹ کو سنجیدگی کے اژدہے نے نگل لیا۔ اب وہ غور کر رہا تھا کہ میں نے ایک غریب عورت پر جرمانہ تو کرا دیا مگر وہ اس کو ادا نہیں کر پائے گی اور اس کا جو نتیجہ ہوگا اس سے جوگلی کے دل میں اور بھی اس کے لئے نفرت بڑھے گی۔ وہ سنجیدگی سے سوچ رہا تھا کہ اب اگر رینجر صاحب سے جرمانہ معاف کرنے کی سفارش بھی کی جائے تو کاغذی کارروائی پوری ہو گئی ہے دوسرے وہ اس سفارش سے بدظن

بھی ہو سکتے ہیں لہذا اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ ننھے انہی خیالات میں اُلجھا ہوا تھا کہ بھنی کا پردھان وہاں آ پہنچا۔

رینجر صاحب (میری سیوا پہنچے۔ پہاڑی اونچے طبقے کا سلام)

"رام رام۔ تم کون ہو کیسے آنا ہوا۔" رینجر صاحب نے افسرانہ لہجے میں کہا۔

"میں بھنی کا پردھان ہوں۔ میں نے سُنا ہے کہ تمہارا فارسٹ گارڈ جو گلی کو تیتر مارنے کے جُرم میں پکڑ کر لے گیا ہے۔"

"جی ہاں وہ ہماری حراست میں ہے۔ اس پر جُرمانہ بھی کر دیا گیا ہے تمہیں کچھ کہنا ہے۔"

"ہاں سرکار مجھے یہ کہنا ہے کہ وہ ایک ودھوا ہے۔ اس کا شوہر سیما سُرکشا دل میں سینک تھا۔ بنگلہ دیش کے سینکوں کی گولی سے مارا گیا تھا۔ اس کی گود میں ایک لڑکا ہے جو مرنے والے کی نشانی ہے۔ باقی پورے گھر میں کوئی نہیں ہے یہ بہت غریب ہے۔ معمولی پنشن اور تین بیگھا زمین اس کے گزارے کا سادھن ہے۔ اس پر جُرمانہ ہی کرنا تھا تو اتنا کرتے کہ یہ غریب آسانی سے ادا کر سکتی۔ پہاڑی لوگوں کو تو آپ جانتے ہی ہیں کہ غریب ہوتے ہیں۔"

"جُرمانہ مجرم کی ہستی کو دیکھ کر نہیں کیا جاتا بلکہ جُرم کی نوعیت دیکھ کر کیا جاتا ہے۔ قانون کو ان تمام باتوں سے کیا مطلب جو آپ سُنا رہے ہیں۔"

"رینجر صاحب میں اس وقت ایک انسان سے بات کر رہا ہوں قانون سے نہیں۔"

"تم اس کی اتنی طرفداری کر رہے ہو تو جُرمانہ خود ادا کر دو مگر ہمارے قلم سے جو نکل گیا وہ واپس نہیں ہوتا ہے یہ افسر کا حکم ہے کسی معمولی آدمی کا نہیں۔"

"ٹھیک ہے صاحب آپ اپنا قانون دیکھیں یہ جُرمانہ میں ہی ادا کروں گا لیکن یہ بہو آپ کی حراست میں نہیں رہے گی۔ بستی کی ناک تھوڑے ہی کٹوائی

ہے۔" کہتا ہوا پردھان چلا گیا اور روپیہ لاکر جرمانہ ادا کر کے جوگلی دیوی کو چھڑا لے گیا۔ ننھے یہ سب کچھ ٹکر ٹکر دیکھتا رہا۔ وہ اسی ادھیڑ بُن میں پریشان تھا کہ کامیاب ہو کر بھی ناکامیابی رہی اب جوگلی کے دل میں جگہ پانے کے لئے بہت بڑی قربانی کرنی پڑے گی کیونکہ جوگلی اب اُس سے متنفر ہو چکی تھی۔ وہ یہ بھی سمجھ رہا تھا کہ "اس زمانے میں کوئی کسی کی مدد بغیر مطلب نہیں کرتا۔ اس پردھان نے اتنی بڑی رقم لاکر ایک دم دے دی ضرور کچھ دال میں کالا ہے۔ بے سہارا اور غریب عورت کے لئے اتنا روپیہ ادا کرنا چغلی کھاتا ہے کہ معاملہ مشکوک ہے اور پیار محبت میں ہی اس قسم کی قربانی کی جا سکتی ہے۔"

ننھے گارڈ کے اس جال سے جوگلی کا بچ نکلنا اس امر کا کھلا ثبوت تھا کہ اب جوگلی کے دل میں ننھے کے لئے نفرت کے سوا اور کیا ہوگا۔ مگر ننھے کے دل میں تو جوگلی نے اور بھی چنگاریاں سُلگا دی تھیں لہٰذا وہ جوگلی کو پھانسنے کی اور ترکیبیں سوچنے لگا اور اسے یہ بھی احساس تھا کہ اس نے جوگلی کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔

جوگلی نے اپنے بیاہ کا بچا کھچا زیور اور گھر کا کچھ سامان اور برتن بھی بیچ ڈالے مگر اس کے باوجود پردھان کی بارہ سو روپے کی رقم فراہم نہ ہو سکی تو اس نے اپنی زندگی کا آخری اثاثہ تین بیگھے زمین بھی ایک پڑوسی کے ہاں گروی رکھ دی اور اس طرح وہ پردھان کے قرض سے بری ہو گئی۔ ننھے کو جب اس ساری حقیقت کا پتہ چلا تو اس کے دل سے پردھان کی رقابت کا شک جاتا رہا اور وہ دلی ندامت کے ساتھ سنجیدگی سے جوگلی کے بارے میں سوچنے لگا کہ وہ کس طرح اپنے گناہ کا کفارہ کر سکتا ہے۔ ننھے کی ضمیر اس پر ہزاروں لعنتیں بھیج رہی تھی اور وہ ذہنی طور پر نہ صرف پشیمان تھا بلکہ دل و جان سے جوگلی کی اس مصیبت کو دُور کر کے اسے اپنا بنانا چاہتا تھا۔

اُدھر پردھان جی اپنی رقم کی واپسی کے باوجود جوگلی کی پریشانی اور خستہ حالی

سے پوری طرح واقف تھے اور وہ دل ہی دل میں جوگلی کو ان پریشانیوں سے نجات دلوانے کے لئے سوچتے رہے اور اچانک پردھان جی ننھے سنگھ کے تھڑے پر گئے اور ننھے سے مخاطب ہو کر کہنے لگے۔

"گارڈ صاحب آپ نے اور آپ کے افسر نے بے چاری جوگلی کو دانے دانے کو محتاج تو کر دیا اب اس پر ترس کھا کر جنگل کاٹنے والے مزدوروں کے ساتھ کہیں مناسب کام ہی دلوا دو جس سے وہ اپنا پیٹ تو پال سکے"۔ پردھان جی کا مشورہ غور سے سُننے کے بعد ننھے بولا "آپ کی اس بات کو پورا کرنے کے لئے میں پوری پوری کوشش کروں گا"۔ ننھے نے اعتماد کے ساتھ پردھان جی سے کہا۔

"جنگلی پیڑوں پر سرکاری آدمی مُہر لگاتے ہیں۔ ٹھیکیدار کے آدمی بھی ساتھ ہی رہتے ہیں اور ٹھوس کھوکھلے پیڑوں کو الگ الگ لکھتے جاتے ہیں۔ لوہے کے گھن پر مہر کھُدی ہوتی ہے۔ وہ پیڑ پر مارا جاتا ہے اس کی آواز سے ٹھوس اور کھوکھلے پیڑ کا پتہ چل جاتا ہے۔ جوگلی اس کام کو آسانی سے کر سکے گی کوئی خراب کام بھی نہیں ہے۔ ٹھیکیدار ہمارے دباؤ میں رہتا ہے وہ اس کا خیال رکھے گا۔ میں جوگلی کو زیادہ سے زیادہ مزدوری دلواؤں گا"۔

کچھ دنوں بعد ہی ننھے نے دل کو شش کر کے جوگلی کو یہ کام دلوا دیا۔ جوگلی دیوی دن بھر بچے کو بانس کی کھپچیوں کی کنڈیا میں کمر پر لٹکائے ٹھیکیدار کے آدمیوں کے ساتھ پیڑوں پر ٹھپے لگاتی رہتی۔ اب وہ خوش تھی۔ پیٹ بھرنے کے بعد بھی وہ کچھ نہ کچھ روز بچا کے رکھ لیتی تھی۔ بہت دنوں تک کام یونہی چلتا رہا۔ جوگلی گو شودر تھی مگر اس کا ناک نقشہ رنگ روپ چال ڈھال دل پسند تھے۔ اور اسی لئے وہ ٹھیکیدار کی نظروں میں بھی کھٹکنے لگی۔ ٹھیکیدار کا خیال تھا کہ وہ ایک غریب مزدورنی ہے چند سکوں میں بہک جائے گی اور اس کی ہوس کا شکار ہو جائے گی۔ یہی سوچ کر ایک دن اس نے اپنے تھڑے پر سارے مزدوروں کو اجرت تو دے دی مگر

جوگلی دیوی کی طرف توجہ ہی نہیں دی۔ جوگلی صبر سے بیٹھی رہی، صبر تو غریب کا خاص گُن ہوتا ہے۔ کچھ دیر بعد ٹھیکیدار بولا "جوگلی مَیں تم کو دوسرے مزدوروں سے زیادہ اُجرت دیا کروں گا اسی لئے تمھیں سب کے سامنے ادائیگی نہیں کی بُرا مت ماننا! اور اگر تُم نے اچھا کام کیا تو انعام بھی دیا کروں گا۔" جوگلی سُنتی رہی اور ٹھیکیدار کے ہر لفظ پر غور کرتی رہی۔ جب وہ چُپ ہو گیا تو جوگلی نے کہا "بڑے لوگوں کو غریبوں کی مدد کرنا ہی چاہیئے۔ اب مَیں چلتی ہوں۔" جیسے ہی وہ جانے کے لئے اٹھی ٹھیکیدار نے اُٹھ کے دروازہ بند کر دیا۔ اب جوگلی کی آنکھیں کُھلیں اور اسے اپنی آبرو خطرے میں دکھائی دینے لگی مگر اس نے ہمت سے کام لیا اور زبردستی دروازہ کھول کر باہر جانے کی کوشش کرنے لگی۔ لیکن عورت عورت ہی ہوتی ہے وہ مرد کا مقابلہ کیا کر سکتی تھی۔ ٹھیکیدار نے جوگلی کو پیچھے دھکیل دیا وہ چارپائی پر گر گئی اور کنڈیا سے نکل کر بچہ بھی دُور جا گرا۔ اس نے جلدی سے بچہ کو اُٹھا کر سینہ سے لگا لیا اور غصہ میں کانپتی کھڑی کھڑی بچاؤ کی کوئی ترکیب سوچتی رہی۔ ٹھیکیدار اس کی طرف بڑھتے ہوئے کہنے لگا۔ "تم گھبراتی کیوں ہو مَیں کوئی بھیڑیا تھوڑے ہی ہوں۔ صرف تم سے پیار کروں گا اور بس" کہتے ہوئے اس نے جوگلی کو اپنی بانہوں میں بھینچ لیا وہ کسمساتی رہی اور وہ اس کا مُنہ بند کر دیتا تھا بچہ بھی بار بار رو رہا تھا۔

اِدھر جوگلی کو گھر پہنچنے میں کافی دیر ہو چکی تھی ننھے جوگلی کی تاک جھانک میں رہتا تھا اس کے چال چلن پر نظر رکھتا تھا۔ اس کا مرا ہوا شک پھر زندہ ہو گیا اور اس نے سوچا کہ جوگلی پردھان کے گھر چلی گئی ہو گی۔ عورت کو بدلنے میں کچھ دیر نہیں لگتی ہے جب وہ پردھان کے گھر گیا تو جوگلی وہاں بھی نہیں تھی۔ اب اس کا ماتھا ٹھنکا اور ٹھیکیدار کے تھڑے کی طرف روانہ ہو گیا۔ جنگل میں ذرا سی آواز بھی بہت دُور سے سُنائی دے جاتی ہے۔ جوگلی کے چلانے کی آواز ننھے کے کانوں میں پہنچی اور وہ اصلیت کو بھانپ گیا اور تیزی سے اُدھر لپکا "ٹھیکیدار یہ کیسا شور ہے" اس نے دروازے کو جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔ ٹھیکیدار ننھے سنگھ کی آواز سُنتے ہی جوگلی

بولے۔

"آپ کے سیوک کی ماں ہے پتاجی۔"

"اری کل تو اچھا بھلا تھا دن بھر شادی کا کام کرتا رہا تھا۔ اب رات ہی رات میں اتنا بیمار پڑ گیا۔" ساہو صاحب ہاتھوں میں بالیاں اُچھالتے ہوئے ترازو کی طرف بڑھے۔ "لے کوئی اور ہوتا تو منع ہی کر دیتا۔ تو سیوا کی ماں ہے۔ تیرا کام تو کرنا ہی پڑے گا۔ اس کو تکلیف زیادہ تو نہیں ہے؟"

"سرکار ہیضہ ہو گیا ہے۔" یہ کہہ کر وہ سسکنے لگی۔

"اری شادی کا گھر ہے رونا اپنے گھر جا کر۔ یہاں رو کر آشگن مت کر۔"

یہ سنتے ہی کسی ناقابلِ اظہار خوف سے وہ چپ ہو گئی۔ "لے نو مل سکتے ہیں۔"

"سرکار بیس کر دیجئے نو سے کام نہیں چلے گا۔"

"گروی رکھنے آئی ہے یا قرض لینے۔" آواز میں سختی لاتے ہوئے ساہو صاحب نے کہا۔

"جو چاہیں سمجھ لیں مگر یہ ایک طرح کی امداد ہی ہے۔ جب اچھا ہو جائے گا تو دیدوں گی۔ کام تو آپ ہی کے یہاں کرے گا۔ تنخواہ میں کاٹ لیجئے۔"

اور اگر مر گیا تو؟" یہ بات سنتے ہی اُس کے تن میں آگ سی لگ گئی لیکن صورتِ حال نازک تھی۔ لوؤں میں تپتے ہوئے پھولوں کی طرح خاموشی سے تکلیف کو ضبط کر گئی اور نو روپیوں کے لئے ہی ہاتھ بڑھا دیئے اب اس کی جیب گرم تھی وہ ڈاکٹر کے پاس گئی۔ ڈاکٹر چلنے کو راضی ہو گیا، وہ گھر پہنچی۔

"ماتاجی تم نے مجھ سے چلتی بار کہا تھا کہ بھیا کو پانی مت دینا ہیضے میں پانی نہیں دیتے ہیں۔ سو اس نے خود اُٹھ کر ایک لوٹا پانی ڈک ڈک کر پی لیا۔ میرے منع کرنے پر بھی نہ مانا۔" ماں پھلیا کی شکایت پر بھی کچھ نہ بولی اور گم سم کھڑی رہی۔ اس خاموشی پر پھلیا من ہی من بہت جھنجھلائی مگر چپ رہی اور سوچتی رہی کہ کچھ

کا ہاتھ چھوڑ کر سٹپٹایا ہوا سا باہر نکلا۔ جوگلی بھی پسینے میں تربال بکھرائے ہوئے بے حال بچے کو سنبھالتی ہوئی باہر آئی۔ وہ ہانپ رہی تھی۔ ننھے کے جسم میں آگ لگ گئی اور وہ کڑک کر بولا "کمینے تو نے ایک ایسی غریب بے سہارا بیوہ عورت پر حملہ کیا ہے جس کو میں نے یہاں کام پر لگایا تھا تو نے اس پر بُری نیت رکھی اور ایسی کمینہ حرکت کی۔ تیری بدچلنی کی شکایت رینجر صاحب سے کروں گا اور تجھے کل ہی یہاں سے نکلوا دوں گا۔" یہ سُنتے ہی ٹھیکیدار کی ہوائیاں اُڑ گئیں۔ اس نے ہاتھ جوڑ کر اپنی غلطی کی معافی مانگی پیروں پر گر کر گڑگڑانے لگا۔

"یوں گڑگڑانے سے کام نہیں چلے گا اس بدتمیزی کی سزا بھگتنی ہوگی۔"

"میں تیار ہوں۔"

"ٹھیک ہے بارہ سو روپیہ نکال کر اس کو دیدو۔"

"بارہ سو روپیہ تو بہت ہے۔ دس بیس کہتے تو معمولی بات تھی۔" ننھے نے غضب ناک لہجے میں کہا "ہمارے یہاں سودے بازی نہیں ہوتی ہے جو کہتے ہیں وہ پتھر کی لکیر ہوتی ہے اگر کم وبیش کرانے ہیں تو رینجر صاحب کے پاس چل۔"

"نہیں نہیں میں وہاں نہیں جاؤں گا" کہتے ہوئے اُس نے چُپ چاپ بارہ سو روپے نکال کے جوگلی کی طرف بڑھا دیئے۔ جونہی جوگلی پیچھے ہٹی ننھے نے آنکھ کے اشارے سے لے لینے کو کہا اُس نے روپے تھام لئے۔ ٹھیکیدار نے یہ جُرمانہ اس لئے منظور کر لیا تھا کہ اُسے فارسٹ گارڈ سے بہت نفع تھا۔ وہ سینکڑوں سال اور دیودار کے ایسے پیڑ کٹوا دیتا تھا جن پر پچھلے سال کی مہر نہیں ہوتی تھی۔ اگر آج گارڈ کا کہنا نہیں مانتا تو ہزاروں کے گھاٹے میں رہتا اور ٹھیکیداری بھی ختم ہو جاتی۔

"چل جوگلی۔ تو ڈرمت جانا۔ ٹھیکے لگانے روز آنا۔ کام چھوڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کل یہی لوگ تیری حفاظت کریں گے نہیں تو اِن سالوں کو دُنیا سے ہی وداع کروا دوں گا۔" کہتے ہوئے ننھے سنگھ جوگلی دیوی کو اپنے ڈیرے کی طرف لے گیا "تم مجھے اِدھر کیوں لے جا رہے ہو میرے گھر کیوں نہیں جانے

دے رہے" جوگلی نے راستے میں کھڑے ہو کر کہا۔

"آج تم کو دیر ہو گئی ہے اندھیرے میں گھر تک اکیلی کیسے جاؤ گی۔ اور اگر میں تمہارے ساتھ جاتا ہوں تو دیکھنے والے انگلی اٹھائیں گے اس لئے اِدھر لے آیا ہوں یہ گھر بھی تمہارا ہی گھر ہے۔ کھاؤ پیو آرام کرو دن نکلے کام پر چلی جانا۔ تمہارے گھر میں بھی تو تمہارا کوئی نہیں ہے۔" یہ سُن کر جوگلی کی آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگے۔

"ہاں تم ٹھیک کہتے ہو۔" اس نے روندھے ہوئے گلے سے کہا اور مامتا سے بچے کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا "کچھ بھی ہو اپنا گھر پھر اپنا ہی ہوتا ہے۔"

"ٹھیک ہے مگر میں ٹھیکیدار کی طرح نہیں ہوں۔"

"جو کسی کی آبرو بچاتا ہے وہ اُس کی آبرو کا لیٹرا نہیں ہوتا ہے۔" وہ اطمینان سے کہہ کر پلنگ کی پائینتی بیٹھ گئی کنڈیا ایک طرف رکھ دی اب اس نے چین کی سانس لی کھانا کھایا آرام کیا مگر پھر بھی اسے رات بھر نیند نہیں آئی۔ یونہی نیند آنے کا سوانگ بھرتی رہی اور پلک موندے پڑی رہی اسے پھر بھی کوئی ڈر تھا عورت کے مزاج کی یہ قدرتی بات ہے کتنی بار اس کا بچہ رویا بھی مگر وہ دانستہ اسے چپ کرانے کے لئے نہیں اٹھی کیوں کہ سونے کا ڈھونگ بنائے پڑی تھی نئے بھی سویا نہیں تھا جوگلی پلکوں کے پیچھے سے اسے برابر دیکھ رہی تھی۔ وہ اٹھا اور چائے کے لئے بچا ہوا دودھ لا کے چمچے سے روتے ہوئے بچے کو پلایا وہ پیٹ بھر جانے کے بعد پھر سو گیا۔ اس نے بچے کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا اور اپنے پلنگ پر آ لیٹا۔ جوگلی نئے کی اس ہمدردی کو دیکھ کر خوش تھی اب اسے نئے بہت اچھا لگنے لگا تھا اور اس وقت وہ نئے کے پہلے برتاؤ کو بالکل بھول گئی تھی۔ وہ پڑی پڑی سوچ رہی تھی کہ یہ آدمی مجھ سے اتنی ہمدردی کیوں رکھتا ہے اس کے دل نے جلدی ہی اس سوال کا جواب بھی دے دیا۔ بے وقوف سے بے وقوف عورت اس معاملے میں بڑی سمجھ دار ہوتی ہے۔ مگر دوسرے سوال کا جواب اس کے من کو نہیں مل رہا تھا کہ جو شخص پہلے اس کی طرف سے اتنے گندے خیال رکھتا تھا آج اپنے گھر میں موجود ہونے پر بھی کچھ نہیں کہہ رہا نظر اٹھا کر دیکھا تک نہیں۔ سوتے ہوئے جسم کو بھی ہاتھ تک نہیں لگایا اور رات بھر سویا نہیں

اسی طرح دن نکل آیا جنگل میں چاروں طرف بے شمار چڑیاں چہچہانے لگیں، خطرناک درندوں کی ڈراؤنی آوازیں کانوں کے پردے پر ٹکرانے لگیں ننے آنکھیں موندے پڑا تھا وہ مصنوعی خراٹے بھر رہا تھا۔ جوگلی نے دل ہی دل میں سوچا "انھیں اتنی جلدی نیند آگئی نیند کیوں نہ آتے ساری رات جاگے بھی تو ہیں۔ اب مجھے جانا ہے۔ بغیر کہے جانا ٹھیک بھی نہیں اس لئے جاگنے پر آگاہ کر کے ہی جاؤں گی" یوں سوچ سمجھ کر وہ ننے کی طرف بڑھی۔ چارپائی کے پاس جا کر وہ پھر ٹھٹھک گئی اس کے دماغ میں دو باتیں آئیں "آواز دے کر اٹھاؤں یا جسم کو ہلا کر"، آواز دے کر جگانے کی بات جسم ہلا کر جگانے کی بات سے اچھی تھی مگر لمحہ بھر میں اس کا یہ ارادہ پلٹ گیا اس نے سوچا کہ آواز کوئی سن سکتا ہے اور اس طرح بدنامی ہوگی اس لئے جسم کو ہلا کر جگانا ہی مناسب ہوگا۔ یہ سوچ کر اس نے ننھے کے کندھے ہلائے۔ "میں جا رہی ہوں اپنا گھر بار دیکھ لو"

"کیا دن نکل آیا"، انگھتے ہوئے اس نے پوچھا جیسے کہ وہ واقعی نیند سے بیدار ہوا تھا۔

"جی ہاں دن نکل آیا ہے اب میں جاتی ہوں"

"کچھ کھا پی کے جانا ایسے نہیں جانے دوں گا"، کہتے ہوئے ننھا اٹھا اور کچھ تیار رکھا ہوا ناشتہ لے آیا کھانا کھلایا اور تازہ پانی پیا۔

"تم صبح کو چائے نہیں پیتے ہو"، جوگلی کہنے لگی۔

"چائے تو پیتا ہوں مگر آج چائے کے لئے رکھا ہوا دودھ رات میں جنگلی بلونٹا پی گیا، اس لئے چائے نہیں بنائی گئی"۔

"جنگلی بلونٹا یا جوگلی بلونٹا؟" اور ننھے تاڑ گیا کہ اس نے دودھ پلاتے وقت نیم بیداری میں اس کو ضرور دیکھ لیا ہے۔

"اب کہاں جاؤ گی" اس نے سنجیدگی سے کہا۔

"اب گھر جاؤں گی۔ اپنا کام کروں گی ان بارہ سو روپیوں سے زمین بھی

چھڑا دوں گی اور گھر کے سامان بھی خرید دوں گی تاکہ جب لڑکے کی بہو جی آئیں تو یہ نہ کہیں کہ گھر میں کچھ بھی نہیں ہے میں مزدوری تو مجبوری سے کر رہی تھی تم نے میرے بہت کڑے وقت میں مدد کی شکریہ۔"

"جوگی میں بہت دنوں سے ایک بات کہنا چاہتا تھا مگر کہہ نہ سکا۔"

"کہو۔"

"میں رنڈوا ہوں۔"

"میں بھی ایک بات کہنا چاہتی ہوں۔"

"کہو۔"

"میں بیوہ ہوں۔ اور تم جانتے ہو ہمارے سماج میں پُنر وواہ نہیں ہوتا ہے۔" جوگی نے دُکھیاتے ہوئے کہا۔

"اگر تم میرا ساتھ دو تو یہ دقیانوسی سماج تو کیا میں ساری دُنیا کا مقابلہ کر سکتا ہوں، تم ہاں کر دو اور پھر دیکھو۔" یہ کہتے ہوئے ننھے پیار بھری نظروں سے جوگی کو دیکھنے لگا۔ جوگی بھی ننھے کی طرف دیکھ کر مسکرا دی اور ننھے پرانے رسم ورواج کے ہیر دشما پر یم گرانے کو تیار ہو گیا۔

پاس ہو گئے

"کیا آج تمہارے پاس کوئی کام نہیں ہے جو سر جوڑے پانچوں بیٹھی ہو" کرسی اپنی طرف کھینچتے ہوئے شکیلہ نے کہا۔

"مری آ تو بھی شریک ہو جا ہم میں" وینا نے مسکراتے ہوئے کہا "کسی حد تک ہے بھی صحیح کہ مرد توے پر بیٹھ جائے تب بھی اس کا یقین نہیں کرنا چاہئے" وینا نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"ذرا ہمیں بھی تو سمجھاؤ" شکیلہ ذرا سنجیدگی سے بولی۔

"عورت کے ساتھ باعزت سلوک کے بارے میں" نمی نے کہا۔

"یہ تو حقیقت ہے کہ آج کل آدمی اتنا گر گیا ہے کہ خدا کی پناہ۔ کچھ لوگ تو یہ بھی کہنے لگے ہیں کہ عورت مرد کے لئے ہے اور مرد عورت کے لئے یعنی رشتہ ناطہ کوئی چیز ہی نہیں ہے۔"

"یعنی جس پر دل آجائے اُسی کو اپنا لو اور عیش کرو۔ ذرا سوچو تو سہی اگر عورتیں بھی مردوں کی پیروی کرنے لگیں تو یہ مرد منہ دکھانے کے قابل نہ رہیں گے اور عورتوں کی پاکیزگی نام کی کوئی چیز دنیا میں نہ رہے گی۔"

"کچھ بھی ہو ایسا وقت آئے گا ضرور۔ آدمی کو بدلتے دیر ہی کتنی لگتی ہے۔ جس دن عورت بھی مرد کے ساتھ بدل جائے گی اُسی دن یہ فرسودہ اور گھسی پٹی پاک دامنی کی داستانیں ختم ہو جائیں گی۔ کسی زمانے میں دام مارگی فرقہ بھی تو تھا" شکیلہ

نے کہا۔

"کیا دام مارگی فرقہ؟" نمی بولا

"یہ ایک ایسا فرقہ تھا کہ اپنے گھر آئے مہمانوں کی خاطر مدارات کے لئے گھر کی بہو بیٹیوں کو بھی مہمانوں کی خدمت میں پیش کرنا فرائض مہمان نوازی سمجھتے تھے" شکیلہ نے اپنی معلومات کو فخریہ انداز میں پیش کرتے ہوئے کہا

"یہ مہمان داری تو خوب رہتی ہوگی۔" چمپا نے حیرت انگیز لہجے میں کہا۔

"تمھیں حیرت ہو رہی ہے۔ آج کل نائٹ کلبوں میں کیا کچھ نہیں ہوتا ہے" شکیلہ نے آنکھیں مٹکاتے ہوئے کہا۔

"تم کہتی ہو ہمارے یہاں تو وہ رات کو گیارہ بجے سے پہلے دہلیز میں قدم ہی نہیں رکھتے۔ اور آتے ہی ایسے سو جاتے ہیں جیسے ماؤنٹ ایورسٹ کی چوٹی سر کر کے آئے ہوں۔ اگر دیر سے آنے کی وجہ پوچھتی ہوں تو گڑھے گڑھائے سو بہانے سنا دیتے ہیں۔" چمپا نے روہنسی آواز میں کہا۔

"اس حمام میں سب ننگے دکھائی دیتے ہیں۔ کسی بھی مرد کا چلن ٹھیک نہیں ہے۔ سیکس کے معاملے میں ہر مرد ناپختہ ذہن رکھتا ہے۔ میرے آدمی میں بھی ایک لت ہے جس پہ ہنسی بھی آتی ہے اور غصہ بھی" شکیلہ دل کے پھپھولے پھوڑتے ہوئے بولی۔

"کیا لت ہے۔" وینا نے لقمہ دیا۔

"خواہ پارٹی ہو، خواہ شادی کی تقریب، یا بازار میں شاپنگ کی جا رہی ہو۔ جدھر عورتیں ہوں گی ادھر ہی گھسنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جانے کیا ملتا ہے اس اوچھے پن سے۔ مجھے تو کوئی شریف لگتا ہی نہیں۔ ہر گاہ کوئی زمانہ جب خواب میں بھی لوگ اچھی باتیں سوچتے تھے اور منہ سے بہن کہہ کر اس پاک رشتہ کو زندگی بھر نبھاتے تھے" شکیلہ بولی

اری نگوڑی میرا شوہر بھی ایسا ہی ہے۔ گلی کوچوں میں، گرلس کالج کے چوراہے پہ، بازاروں میں اسی دھن میں گھومتا رہتا ہے کہ کوئی تو پھنسے گی۔

کماتا کانی کوڑی نہیں ماں باپ کی جائیداد ہے پھونکے جا رہا ہے۔" "سب مردوں کا یہی حال ہے۔ دیکھتی نہیں ہو راہ چلتے بازاروں میں کوئی اچھی صورت دکھائی دے جاتی ہے تو کوئی چور نظروں سے دیکھتا ہے کوئی کنکھیوں سے۔ کالا چشمہ لگانے والوں کا پتہ نہیں کہ وہ کیسے دیکھتے ہیں، غرض دیکھتے سب ہیں اور ایسے دیکھتے ہیں کہ جیسے نگل جائیں گے۔" نمی بولی۔

نمی تم سب کی باتوں سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ لوگوں کا کیریکٹر گرتا جا رہا ہے۔ شرافت ختم ہو چکی ہے۔"

"اور کیا یہ جھوٹ ہے؟"

"نہیں ایسا نہیں ہے اور نہ ہی دنیا میں ایسا کبھی ہوگا۔ اچھائی برائی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ کبھی اچھائی زیادہ کبھی برائی زیادہ مگر یہ ختم کبھی نہیں ہوتیں اور نہ کبھی ہوں گی۔ اسی زمین پر بے شمار ایسے مرد بھی ہیں جو نامحرم عورتوں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے۔"

"آہا ہا" سب کھلکھلا کے ہنس پڑیں۔

"ایسے کسی ایک مرد کا نام تو لیجئے۔" نمی نے کہا

"میرے آدمی ہی کو دیکھ لو۔ کبھی دوسری عورت سے بلّہ تک نہیں بھڑاتا۔ عورتوں کے بارے میں چھوٹی باتیں تک نہیں سنتا۔ اس کا کہنا ہے کہ کوئی سندر رہے تو اپنے پتی کے لئے۔ کوئی دولت مند ہے تو اپنے گھر کے لئے۔ آدمی کو جو کچھ مل گیا اسی پر صبر کرنا چاہئے۔ اسی میں لطف ہے۔" رادھے نے فخریہ کہا۔

"ایسے لوگ صرف آدرش وادی ہی ہوتے ہیں بالکل بگلا بھگت جو شرافت کا لبادہ اوڑھے ہوئے ہوتے ہیں اور اندر سے بالکل اس کے برعکس۔ آدمی کی یہ فطری کمزوری کبھی دور نہیں ہو سکتی۔ باتیں چاہے کوئی کیسی ہی کرے۔" شکیلہ نے اعتماد سے کہا اور سب ہی نے اس کی پرزور تائید کی۔

"شکیلہ ایک ہی بات سب پر لاگو نہیں ہو سکتی۔ کوئی کیسا بھی ہو مگر میرا آدمی تو دیوتا

ہے دیوتا۔ میں سب کچھ سُن سکتی ہوں مگر اپنے آدمی کی بُرائی نہیں سکتی۔" رادھے نے کہا۔

"شاید تم ٹھیک کہتی ہو۔" نمّی نے ریمارک کسا اور کچھ دیر کے لئے سب خاموش ہوگئیں۔ یکایک نمّی نے تجویز رکھی کہ کیوں نہ آج رادھے کے پتی کی شرافت کا امتحان لیا جائے۔ سب کو اپنا ہم نوا پا کر نمّی کہنے لگی کہ "رادھے کے پتی میرے دیور ہوتے ہیں۔ میں ان کے بستر پر لحاف اوڑھ کر سو جاؤں گی اور تم تینوں دوسرے کمرے میں کھڑکی پر کھڑی چُپ چاپ دیکھتی رہنا اور رادھے پلنگ کے نیچے لیٹ جائے گی۔"

"اگر انھوں نے اندر آتے ہی کمرے میں اکیلی دیکھ کر دروازہ بند کر کے دھر دبوچا تو؟"

"آدمی دُنیا میں سب کچھ کر سکتا ہے مگر اپنی بیوی کی موجودگی میں کسی دوسری عورت سے ایسا نہیں کر سکتا۔" نمّی کے اس جواب پر سب چُپ ہوگئیں اور اپنے اپنے فرائض کی سرانجامی میں لگ گئیں۔

رادھے کے پتی شیام بابو دُکان بند کرنے کے بعد گھر لوٹے اور دالان میں داخل ہوتے ہی چلّانے لگے۔ "رادھے اور رادھے اری کیا بات ہے جو آج سنسان ہے۔ وینا۔ وینا؟ بھئی عورتیں بھی بڑی لاپرواہ ہوتی ہیں۔ کہیں جانا ہی تھا تو دروازہ بند کر کے تو گئی ہوتیں۔ لوگ آنکھوں کے سامنے سے بستر اٹھا لیتے ہیں۔ اٹیچیاں غائب کر دیتے ہیں۔ جیبیں کاٹ لیتے ہیں تو بھلا گھر میں سے مال و اسباب صاف نہیں کیا جا سکتا۔" کہتے کہتے وہ کمرے کے اندر آ گئے۔ نظر پلنگ پر پڑی۔ "یہ لحاف اوڑھے پلنگ پر کون سو رہا ہے۔" بڑبڑاتے ہوئے وہ اُدھر بڑھے اور لحاف اٹھاتے ہوئے "رادھے کچھ طبیعت ....." دیکھتے ہی وہ چونک اٹھے۔ "بھابی آج تک تم میرے کمرے میں نہیں آئیں آج یہاں کیسے سو رہی ہو۔" پلنگ سے دُور ہٹ کر بولے۔

"کئی دن سے میں ایسے موقع کی تلاش میں تھی۔ آج یہ موقع ملا ہے کہ وہ دونوں پڑوس میں گئی ہیں۔ جلدی آنے والی نہیں۔ میں تم کو بہت چاہتی ہوں۔ یہ موقع غنیمت

جان کر یہاں لیٹ گئی آؤ تم بھی میرے ساتھ لیٹ جاؤ اور اگر تم نے میری خواہش ٹھکرا دی تو میں شور مچا دوں گی کہ شیام بابو نے مجھے یہاں کسی بہانے سے بُلا کر پکڑ لیا اور میری عزت لُوٹنے کی کوشش کی۔"

"اگر تم شور مچا سکتی ہو تو میں بھی تو شور مچا سکتا ہوں، کوئی مرد کسی عورت کی آبرو لے سکتا ہے تو کوئی عورت بھی مرد کی آبرو لے سکتی ہے۔" یہ کہتے ہوئے شیام بابو ایسے پیچھے ہٹے جیسے پھنپھناتی ہوئی ناگن سے گھسیرا۔ نمی نے فوراً ان کی دھوتی پکڑ لی اور اپنی طرف کو کھینچی۔ دھوتی کھلتے کھلتے بچی اور جلدی سے شیام بابو نے دونوں ہاتھوں سے دھوتی پکڑ لی۔

"نمی۔ یہاں سے تم ابھی چلی جاؤ ورنہ میں تمہارے گھر جا کر بھیا سے سب کچھ بتاتا ہوں۔ گھڑی بھر میں سارا بھوت اُتر جائے گا۔ پاگل کہیں کی۔" یوں کہتے ہوئے دھوتی کو سنبھالتے ہوئے وہ کمرے سے باہر نکلے تو صحن میں دینا سوئٹر بُن رہی تھی۔

"تیری بھابی کہاں ہے۔"

"آپ کے کمرے میں۔"

"بدتمیز۔ جب میں کمرے میں گیا تو تُو کہاں تھی۔ پتہ ہے کمرے میں کون ہے۔" شیام بابو نے غُصّہ سے کپکپاتے ہوئے کہا۔

"بھیا میں تو اُس وقت رسوئی میں تھی۔ رہی بھابی جی کی بات وہ آپ کے کمرے میں ہیں۔"

"تیرا دماغ تو خراب نہیں ہے۔"

"نہیں بھیا میں سچ کہہ رہی ہوں۔ جا کر دیکھ لو بھابی پلنگ پر لیٹی ہوئی ہیں۔" دینا اطمینان سے بولی۔

"میری بھابی یا تیری بھابی۔"

"میری بھابی۔ آپ کی رادھے" یوں کہہ کر وہ سوئٹر بننے لگی۔

"ذرا میرے ساتھ چلنا۔"

"چلئے۔" وینا پیچھے پیچھے چل پڑی۔ دروازہ پر پہنچ کر اس نے کہا "بھابی۔"
"ہاں وینا۔" اندر سے آواز آئی بالکل رادھے کی آواز
"بھیا آرہے ہیں۔"
"آئیے آئیے آپ کو بھلا پوچھنے کی کیا ضرورت تھی۔" یہ سن کر شیام بابو حیرت میں پڑ گئے۔
"تم جادوگرنی کب سے بن گئیں؟"
"جب سے میری سہیلیوں نے آپ کو شک کی نظر سے دیکھا ہے۔" اتنے میں پلنگ کے نیچے سے نمی نکلی اور کھڑکی کی اور سے وہ تینوں بھی کمرے میں آگئیں اور سب مل مل کر اُن کے پیر چھو چھو کر "پاس ہو گئے" "پاس ہو گئے" کہتی ہوئیں اپنے اپنے گھر چلی گئیں۔ شیام بابو سب کا منہ دیکھتے رہے اور کچھ بھی نہ سمجھے۔

نہیں کہنا تھا تو مجھ ہی کو پانی دینے سے روک کر بھیا کی نظروں میں بُرا کیوں ٹھہرایا۔ ماں اس کے پچکے ہوئے گال، اندر دھنسی ہوئی آنکھیں کھڑی کھڑی دیکھ رہی تھی۔

"ماتا جی میں چاہے مروں چاہے جیوں تم میرے پاس سے پل بھر کو بھی کہیں جاؤ مت تمہارے پاس رہنے سے میرا دُکھ کم ہو جاتا ہے۔ میرا سر اپنی گود میں رکھے بیٹھی رہو۔ غریب دُنیا میں اسی طرح جیتے ہیں کہ جیون میں روٹی نہ ملے مریں تو پانی نہ ملے۔" پیاس سے سوکھے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے سیوا نے کہا۔

"بیٹا میں تو تمہارے لئے ڈاکٹر کو بلانے گئی تھی وہ تم کو آتے ہی ٹھیک کر دے گا۔"

"اس کے لئے روپے کہاں سے آئیں گے۔" سیوا نے دبی آواز میں پوچھا۔

"بیٹا میرے پاس یہ دیکھ نو روپے ہیں اس کو دینے کے لئے۔"

"ارے یہ تمہارے پاس کہاں سے آئے۔"

"بہت پہلے کے رکھے ہیں" کانوں کو دھوتی میں چھپاتے ہوئے کہا۔

"ماتا جی یہ روپے اگر تم پر پہلے سے تھے تو تم نے آٹا کیوں نہیں منگا لیا۔ اگر میں نے روٹی کھائی ہوتی تو ہیضہ نہیں ہوتا تم اور بہن بھی بھوکی نہ رہتی۔ تم نے یہ روپیہ بچایا اور ہم سب کو بھوکوں مارا۔ روپے ہوتے کاہے کے لئے ہیں۔" ڈاکٹر صاحب بھی آ پہنچے۔ ماں یہ باتیں سُن کر رونے لگی جس کی وجہ بیچارہ سیوا بھی نہیں سمجھتا تھا۔ ڈاکٹر نے اس کے رونے کا دوسرا ہی مطلب لگایا اور جلدی سے دیکھ بھال شروع کر دی۔ سُوئی لگائی گولی نگلوائی۔ "دس روپے دو جلدی جانا ہے اور مریض انتظار دیکھتے ہوں گے۔"

"ڈاکٹر صاحب یہ نو لو ایک شام کو بھجوا دوں گی۔" ڈاکٹر نے نو ہی لے لئے اور تیزی سے نکل گیا۔ لوگوں نے باہر حال پوچھا تو بچنے کی اُمید نہیں ہے۔"

بھولا بھٹکا

پوٹلی بغل میں دبائے مکندی بہت دیر سے اپنے دوست پرمو کے انتظار میں کھڑا تھا۔ معمول کے خلاف آج اُسے آنے میں نہ معلوم کیوں دیر ہوگئی تھی۔ مکندی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے اس کی راہ دیکھ رہا تھا کہ پرمو آتا دکھائی دیا تو مکندی بے ساختہ شکایت کے لہجہ میں کہنے لگا۔ "پرمو تو نے تو آج سکھا دیا کیا ہوا جو اتنی دیر لگ گئی۔

"کچھ نہیں یار۔ یہ بغل میں کیا دبائے ہوئے ہو۔" پرمو نے پوچھا۔

"شیشے کی پالکی کی رنگین دلہن کے لئے کچھ نہ کچھ تو چاہیئے ہی لے تو اس کو بیچ لائیں تو جاؤں گا نہیں۔" زیورات کی پوٹلی پرمو کی طرف بڑھاتے ہوئے مکندی نے کہا۔

"تو نے اپنی بیوی کے گہنے تو پہلے ہی گروی رکھ دیئے ہیں اور اُن کے چھڑانے کی کوئی امید بھی نہیں ہے۔ آج کس کے گہنے لے آیا۔" پوٹلی کھولتے ہوئے پرمو نے کہا۔

"اپنی لڑکی سُرتا کے ہیں۔"

"لڑکی کے گہنے بیچ کر شراب پیو گے۔ مکندی تمہارا دماغ تو نہیں چل گیا ہے ان گہنوں کے پیچھے اُس کو سسرال میں طرح طرح کے طعنے سننے پڑیں گے اور اس کا جینا حرام ہو جائے گا۔ وہ ہر ایک کی نظر میں گر جائے گی تمہاری بیوی تو مر گئی اس

کے گہنے نہیں رہے تو کوئی بات نہیں مگر یہ بات بہت طول پکڑے گی۔"

"چل بے گدھے اپنے شوق کو پورا کرنے میں کہیں یہ باتیں دیکھی جاتی ہیں۔ دیکھ ایک بات مَیں تیری مان سکتا ہوں کہ بجائے بیچنے کے ان کو گروی رکھے دیتا ہوں۔ جیسا موقع ہوگا دیکھا جائے گا۔ لیکن دیانند کے ہاں گروی رکھنے تو جائے گا مَیں نہیں۔"

مُکندی کی یہ بات سُن کر پرمونے پوٹلی سنبھالی اور دیانند کے ہاں گروی رکھنے کے لئے چل پڑا۔ مگر پرمونے یہ عقل مندی کی کہ اس نے دیانند سے صاف صاف بتا دیا کہ وہ ان زیورات کو مُکندی کی طرف سے گروی رکھنے آیا ہے۔

مُکندی کا بیٹا کرن اپنے باپ کی شراب نوشی سے عاجز آ گیا تھا۔ باپ گھر کی ہر چیز بیچ کر شراب نوشی پر اُترا ہوا تھا۔ باپ بیٹے کا رشتہ تھا۔ کرن باپ کو سمجھا ہی تو سکتا تھا مگر باپ بالکل ہی چکنا گھڑا تھا۔ اور اس پر کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ مجبوراً وہ باپ کو تنہا چھوڑ کر علیحدہ ہو گیا اور ڈیڑھ سو روپیہ ماہانہ کے عوض ایک ورک شاپ میں کام کرنے لگا۔ جب اسے کہیں باہر ورک شاپ کے کام پر جانا پڑتا تھا تو اوپر کی ساری آمدنی اس کی اپنی ہوتی تھی۔ اس طرح جو کچھ بھی اسے ملتا تھا وہ اپنی بہن سُرتا کو لا کر دے دیتا تھا۔ ایک بار جب سُرتا روپے گن رہی تھی تبھی مُکندی آ گیا اور جھومتے ہوئے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولا "ان روپوں میں سے کچھ روپے تو ہمیں بھی ملنے چاہئیں۔"

"کس خوشی میں؟" ہونٹ بچورتے ہوئے کرن کہنے لگا۔

"مَیں تیرا باپ نہیں ہوں۔ بہن کو سارے روپے دیدیئے جو پرائے گھر کی ہے۔ اور مجھے ایک بوتل کے لائق روپے بھی نہیں دیئے جس نے تجھے پال پوس کر اتنا بڑا کر دیا۔"

"سب کچھ ٹھیک ہے تم باپ ہو مگر شرابی ہو اور شرابی سے میرا کوئی ناطہ نہیں ہے۔ مَیں غریب ہوں۔ تمہاری ضرورتیں تو پوری کر سکتا ہوں مگر برباد کرنے والے شوق نہیں۔"

"شراب کیا ضرورت نہیں ہوتی ہے کیا؟"

"ہاں یہ کوئی ضرورت نہیں ہے۔"

"تو مجھے ایک روپیہ روز بھی نہیں دے سکتا؟" سکندی نے گڑگڑا کے کہا۔ کرن کو ترس آگیا اور اس نے کہا "ٹھیک ہے میں ایک روپیہ روز طاق میں رکھ دیا کروں گا۔ چاہے تم شراب پیو یا افیون کھاؤ۔ شراب کے نام سے بھی چڑنے والے کا باپ شرابی ہو کتنے دکھ کی بات ہے۔"

"اچھا ایک ہی روپیہ سہی۔"

سکندی باہر چلا گیا۔ دونوں بھائی بہن جاتے ہوئے باپ کو نفرت اور افسوس کی ملی جلی نظروں سے دیکھتے رہے۔ کچھ دیر بعد کرن نے کہا "سُرتا مجھے ایک کسان کے یہاں آئل انجن ٹھیک کرنے جانا ہے۔ تین چار گھنٹے لگیں گے۔ تو کھانا بنا کر تیار رکھنا میں آکر کھالوں گا میرے انتظار میں تو بھوکی مت رہنا۔" کرن اوزاروں کا تھیلا سنبھالتا ہوا چلا گیا۔

"کیا تم سکندی کے لڑکے ہو؟" کسان نے کرن کی صورت دیکھتے ہی پوچھا۔

"جی، ہاں میں اُن ہی کا لڑکا ہوں مگر آپ نے کیسے پہچان لیا میں نے تو آج پہلی مرتبہ ہی آپ کے درشن کئے ہیں۔"

"میں نے تمہاری شکل وصورت سکندی سے ملتی جلتی دیکھ کر اندازہ لگایا۔ کبھی کبھی اندازہ صحیح بھی ہو جاتا ہے مگر ایک بات تعجب کی ہے کہ شرابی کی اولاد کارگر نکل گئی۔"

"زمیندار صاحب کیسی شراب، میں تو پان بیڑی کا بھی گنہگار نہیں ہوں۔" تھیلا میز پر رکھتے ہوئے کرن نے کہا۔

"بس پیٹ پالنے کی چنتا رہتی ہے۔ اس زمانے میں عزت سے روزی کمالی جائے یہ بھی بہت بڑی بات ہے۔" انجن پر نظر ڈالتے ہوئے اس نے بات پوری کی۔

"ہاں بیٹے ٹھیک کہتے ہو۔ ایمانداری سے پیٹ پالنا بھی ایک طرح کا تپ ہے۔ تمھارے خیالات بہت اچھے ہیں۔ ایسے ہی لوگ ترقی کرتے ہیں۔ بھیکم مستری جی کے لئے چائے لاؤ۔"

"زمیندار صاحب چائے بعد میں پیوں گا پہلے انجن کو ٹھیک کرلوں۔ یہ کہتے ہوئے کرن آئل انجن سے جُٹ گیا اور ٹھیک ہی کر کے دم لیا۔

"لیجئے صاحب اس کی خرابی میں نے ٹھیک کی ہے۔ وہ خرابی اب اس میں کبھی نہیں آسکتی۔ اگر یہی خرابی پھر سے ہوئی تو مفت مرمّت کروں گا۔" یہ کہہ کر کرن کھڑا ہوگیا۔

"بیٹھو مستری جی کیا جلدی ہے۔ بولو کیا پیش کیا جائے۔" زمیندار نے خوش ہوتے ہوئے پوچھا۔

"جو چاہو سو دیدو صاحب میں اپنے مُنہ سے کچھ نہیں کہوں گا۔"

"مستری جی ہم تمھاری شرافت سے بہت خوش ہیں اور اس خوشی میں ہم تمھاری ماں اور بہن کے وہ گہنے جو تمھارے باپ نے ہمارے یہاں گروی رکھے ہوئے ہیں بغیر سُود لئے ہی تم کو دیدیں گے جب چاہو چھڑا لینا نہ سہی ایک گاہک۔"

"ساہو صاحب مجھے سب کچھ معلوم ہے مگر آمدنی کم ہے اس لئے چھڑا نہیں پارہا ہوں چھڑاؤں گا ضرور مگر پہلے بہن کے زیور چھڑاؤں گا۔" کرن نے بات بنائی حالانکہ اس کو کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔ زمیندار صاحب نے خوشی سے کرن کو بیس روپے دیئے اور وہ گھر چلا آیا۔ بھائی کے مرجھائے ہوئے چہرے کو دیکھتے ہی بولی "کیا آج مزدوری نہیں ملی یا اُمید سے کم ملی ہے؟"

"مزدوری ملی اور امید سے زیادہ۔"

"پھر سست کیوں ہو؟"

"ذرا اپنے گہنے تو دکھانا؟" یہ سُنتے ہی سُرتھا کا ماتھا ٹھنکا۔ وہ جلدی سے اٹھی اور صندوق کھولا تو گہنوں کا نام و نشان نہ تھا۔ وہ اُداس اُداس سی بھائی

کے سامنے آکھڑی ہوئی۔

"کیوں مل گئے؟"

"کچھ بھی نہیں ہے بھیا" ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولی۔

"تمھارے پتاجی نے جہاں ماں کا زیور گروی رکھ کر شراب پی وہیں تمھارا زیور بھی گیا۔" بیٹھک میں بیٹھا مکندی ان دونوں کی باتیں سن رہا تھا اور بہانے تراش رہا تھا مگر کوئی بھی مناسب بہانا نہیں سوجھ پا رہا تھا کہ جسے آمنا سامنا ہونے پر کہہ کے پیچھا چھڑا لیتا "اس کمبخت کو اس بات کا پتہ کیسے چل گیا" مکندی نے من ہی من میں کہا۔

"بھیا یہ بات تمھیں کیسے معلوم ہوئی" کرن نے ساری کہانی سنائی اور کہا "میں نے قسم کھالی ہے جب تک تیرے زیور چھڑا نہ لوں گا چین سے نہ بیٹھوں گا۔ تیس روپیہ مہینہ تو پتاجی لے لیتے ہیں ورنہ اور بھی جلدی چھڑا لیتا۔"

"بھیا تم اتنا روپیہ کیسے جوڑو گے بڑی محنت کرنی پڑے گی۔"

"محنت تیرے گہنوں کے لئے تھوڑے ہی کروں گا اپنے گھر کی آبرو کے لئے کروں گا جس کو مٹی میں ملانے کے لئے ہمارے باپ نے کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے بڑوں کا کیا اولاد کو بھگتنا پڑتا ہے مکندی سب کچھ غور سے سن رہا تھا اور اس کا ضمیر اسے لعنت ملامت کر رہا تھا۔ جیسے جیسے شراب کا نشہ اترتا گیا اس کا شعور جاگتا گیا۔ ساری رات اسے نیند نہیں آئی جاگتے ہی جاگتے دن نکل آیا۔ وہ اٹھا اور چپ چاپ باہر نکل گیا۔ کرن حسب معمول بیٹھک میں ناشتہ لے کر گیا تو باپ کو موجود نہ پایا۔ اسے حیرانی ہوئی کہ جو شخص بنا کھائے گھر سے باہر قدم نہیں رکھتا تھا آج بغیر کھائے کیسے چلا گیا دونوں بہن بھائی باپ کا انتظار کرتے رہے۔ طاق میں رکھا ہوا روپیہ بھی یوں ہی رکھا تھا۔ مکندی شام کو گھر لوٹا تو اس کے قدم لڑکھڑا نہیں رہے تھے۔ منہ سے شراب کی بدبو بھی نہیں آرہی تھی۔ کرن نے باپ کے بدلے ہوئے طور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"پتاجی سویرے ہی سویرے کہاں چلے گئے تھے؟"

"اُس راستے کو ڈھونڈنے جس پر بیس سال پہلے چلا تھا۔ محنت کرتا تھا کُنبے کو پالتا تھا۔ مَیں نے شکٹو کی آڑھت پر پتّے داری کر لی ہے۔ چار روپے کمائے تھے۔ ایک کے چنے اور گُڑ کھا لیا تین روپے یہ ہیں۔ جتنا کماؤں گا تمھیں دوں گا اور اب تم سے ایک پیسہ بھی نہیں لوں گا۔ آج سے مَیں نے شیشے کی پالکی میں آگ لگا دی ہے۔ میری وجہ سے گھر کی پریشانیاں بڑھی ہیں۔ مَیں ہی اُن کو کم بھی کروں گا۔" دونوں بہن بھائی خوشی سے اپنے پتا کو لپٹ گئے اور تینوں کی آنکھوں میں خوشی کی نمی بہتر مستقبل کا پتہ دے رہی تھی۔

نیکی کا نتیجہ

"دس جی۔ ایف۔ یو" ایک نوجوان مسٹر اے نے ابھی ابھی ریل گاڑی سے اُتری ایک برقع پوش عورت کے پیچھے کھڑے ہوتے ایک چھاتہ دھاری مسٹر بی سے کہا نہ تو تیز دھوپ پڑ رہی تھی اور نہ بارش ہی ہو رہی تھی پھر بھی مسٹر بی چھاتا تانے کھڑا تھا۔ پلیٹ فارم پر کھڑے سبھی لوگوں نے یہ دیکھا مگر کسی کو کیا پڑی تھی جو اس سے بلاوجہ چھاتا تاننے کی وجہ پوچھتا جیسے کسی جوان لڑکی کو منی سکرٹ پہنے ہوئے بازار میں گھومتے ہوئے دیکھ کر کوئی معترض نہیں ہوتا — معترض بھی ہو تو ٹوکتا نہیں ہے۔"

"ٹی یو ایس" قریب آکر چھاتا بند کرتے ہوئے مسٹر بی نے کہا اور مسٹر اے ریل گاڑی میں جا بیٹھا، مسٹر بی اس برقع پوش حسینہ کے چاروں طرف منڈلاتا رہا، سیلاب زدہ ندی میں بہتے تیز رَو پانی کی بے تاب لہروں کی طرح، مسافر بھیڑ میں اِدھر سے اُدھر آجا رہے تھے ایسے ہنگامے میں لوگوں کو اپنا ہوش ہی نہیں رہتا دوسروں پر کون دھیان دے برقع پوش عورت اور اس کا شوہر پلیٹ فارم سے باہر نکل کر مسافر خانہ میں ایک بنچ پر جا بیٹھے مسٹر بی بھی بے تابی سے بنچ کے اردگرد گھوم پھر رہا تھا پلک جھپکتے ہی ایک دوسری عورت جو جدید ڈیزائن کے برقع میں تھی پُر وقار انداز سے چلتے ہوئے اسی بنچ پر پہلی عورت کو تھوڑا سا سرکا کر اس کے پاس بیٹھ گئی اور اپنے روتے بچے کو چُپ کرانے کی کوشش کرنے لگی۔ مگر بچہ برابر رو رہا تھا وہ جتنا اسے بہلانے کی کوشش کرتی

بچہ اتنا ہی زیادہ روئے چلا جا رہا تھا کیوں کہ دراصل بچے کو بہلانے کی کوشش محض دکھاوا تھا وہ دانستہ بچے کو رلا رہی تھی تاکہ پاس بیٹھے ہوئے میاں بیوی اس کی طرف راغب ہوں اور ہوا بھی یہی۔ پہلی عورت نے ترس کھا کر کہا "اسے دودھ پلا دو بہن یہ بھوکا معلوم ہوتا ہے۔"

"پلا کہاں سے دوں یہ میرا پیتا نہیں اُوپر کا لانا بھول گئی میرا شہد کا پنل بھی تو جلدی جلدی میں گھر ہی پر رہ گیا۔"

"چائے والے کی دوکان سے لے کر پلا دو۔"

"وہاں لوگوں کی بھیڑ لگی ہے مجھے تو شرم آتی ہے غیروں سے بولتے ہوئے۔"

"یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی لاؤ شیشی نکالو میں اپنے میاں سے منگائے دیتی ہوں۔"

"ہاں ہاں لا یئے کیا حرج ہے میں ابھی لائے دیتا ہوں یوں بھی تو بیکار بیٹھا ہوں،" پہلی خاتون کے شوہر نے بنچ سے اُٹھتے ہوئے کہا۔ بچے والی عورت کا یہی منشا تھا کہ یہ مرد وہاں سے ہٹے۔

اس نے فوراً شیشی نکال کر دیتے ہوئے کہا "آپ تو بہت اچھے لوگ معلوم ہوتے ہیں خاندانی آدمی اسی وضع کے ہوتے ہیں۔" مرد نے شیشی لیتے ہوئے ایک نظر اس کے ہاتھ پر ڈالی جو گورا چٹا تھا اور سیاہ بُرقع میں اس طرح معلوم ہو رہا تھا جیسے سُنار کی گھریا میں پھونک سے لَو ترچھی ہو کر لمبی ہو جاتی ہے۔ وہ شیشی لے کر چلا گیا تو بچے والی نے پہلی عورت سے پوچھا "کہاں کے رہنے والے ہیں آپ؟"

"غریب خانہ نجیب آباد ہے۔ میرے شوہر چوڑیوں کے کارخانہ میں بھٹی کا تاؤ دیکھنے پر ملازم ہیں۔ سو سو روپے ملتے ہیں۔" ہندوستانی عورت کی ذہنیت کے مُطابق کئی باتیں بنا پوچھے ہی اس نے بتا دیں۔

"بھٹی کا تاؤ دیکھنا بھی ایک ہُنر ہے۔" اس نے ریمارک کسا "یہاں کہاں جانا ہے؟"

"غوث نگر (لکھنؤ کا ایک محلّہ) میں حاجی غلام صابر صاحب کے گھر ان کی

لڑکی کے ساتھ میرے دیور کا رشتہ طے ہو رہا ہے۔ آج اسے دیکھنے کا پروگرام ہے ہم نے بارہ بجے آنے کو لکھا تھا مگر یہاں دس بجے ہی آ گئے گاڑی کے وقت کے بارے میں غلط فہمی رہی اب وہ لوگ تو ہمیں اسٹیشن پر لینے پروگرام کے مطابق بارہ بجے ہی آئیں گے اس لئے سوچا یہیں وقت بتا لیں ان کا پتہ تو معلوم ہے مگر گھر تو نہیں دیکھا ہے رکشے والا بھی نہ جانے کہاں کہاں لئے پھرے گا۔ یوں ٹھوکریں کھانے سے بھی کیا فائدہ نقاب اٹھا کے پیچھے ڈالتے ہوئے اس نے کہا۔

"کیا نام ہے آپ کا؟"

"روشن آرا"

"صحیح نام رکھا ہے آپ کے والدین نے" اس کے حسین چہرے پر نظر دوڑاتے ہوئے اس نے مزاحیہ انداز میں کہا "شوہر کا کیا نام ہے؟"

ذرا ہچکچاتے ہوئے بولی "علی عمران" عورتیں شوہر کا نام لیتے ہوئے اس طرح ہچکچاتی ہیں جیسے پنڈت جی چقندر کی سبزی کھاتے ہوئے۔

"ماشاء اللہ کیا خوب نام ہے روشن آرا۔ تم نقاب ڈال لو قسم خدا کی تم مجھ ہی کو اتنی حسین لگ رہی ہو دوسروں کا کیا کہنا نظر لگ جائے گی" دوسری عورت مسکراتے ہوئے کہنے لگی "تمہیں ایک ایسی خوشی کی بات سناتی ہوں بالکل ایسی خوشی کی بات سناؤں گی کہ تم حیرت زدہ رہ جاؤ گی۔"

یہ سن کر روشن آرا بولی "کیا خوشی کی بات سناؤ گی؟"

"یہی کہ ہم ہی تم کو لینے آئے ہیں میرے میاں علی عمران کو ڈھونڈتے پھرتے ہوں گے" ادھر ادھر دیکھتے ہوئے اس عورت نے پیچھے سے برقع سنبھالنے کے بہانے سے بنچ کی پشت پر کچھ لکھ دیا جس کا پہلی عورت کو کچھ پتہ نہیں چلا۔ "یہ لو وہ بھی آ گئے۔" سامنے آتے ہوئے سجیلے نوجوان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس نے کہا۔

"بھئی ہم یہاں کہاں بیٹھ گئیں جس کام سے آئے ہیں اس کا بھی خیال ہے؟"

"الحمد للہ جس کام کے لئے ہم آئے تھے وہ ہو گیا یہی تو ہیں جنہیں ہم لوگ

پینے کے لئے آئے ہیں۔ ان کے میاں دودھ لینے کے لئے گئے ہیں آپ یہیں بیٹھیں جب وہ آجائیں تو انہیں باہر کار تک لینے آنا میں انہیں لے کے چلتی ہوں ہمارے رشتہ دار یہاں بنچ پر بیٹھ رہیں کیا یہ اچھا لگے گا۔

وہ آدمی دوسری عورت کے پیچھے آکھڑا ہوا اور بنچ کی پشت پر لکھا ہوا پڑھ کر اسے مٹا کے بولا "کیا دودھ لینے علی عمران ہی گئے ہیں۔ ؟"

"ہاں! وہی تو گئے ہیں"

"اچھا۔ تو روشن آرا کو لے جا کر کار میں بٹھا۔ میں عمران بھائی کو لے آتا ہوں" اپنے شوہر کا نام اور اپنا نام غیر آدمی کی زبان سے سن کر اسے یقین ہو گیا کہ ضرور حاجی جی کے ہی گھر سے آئے ہیں۔ یہ یقین روشن آرا کے ذہن میں ابھرا اور وہ فوراً بچے والی عورت کے ساتھ کار کی طرف چل پڑی۔ وہ آدمی وہیں بیٹھ گیا جیسے ہی وہ دونوں بنچ سے ہٹ گئیں تو وہ وہاں سے چلتا بنا اور چائے والے کی دوکان کے راستے میں دودھ لانے والے کو تلاش کرنے لگا جوں ہی اس نے ایک شخص کے ہاتھ میں دودھ کی شیشی دیکھی تو اس نے فوراً کہا۔ "السلام علیکم عمران بھائی آؤ پان کھالو"

عمران اچانک غیر آدمی کے منہ سے اپنا نام سن کر حیرت میں پڑ گیا۔ "آپ کون ہیں بھائی صاحب، میں آپ کو پہچانتا نہیں"

"اگر یہی الفاظ آپ اپنے گھر میں مجھ سے کہتے تو میں برا مان جاتا مگر اب برا نہیں مانوں گا کیوں کہ یہ پلیٹ فارم ہے بیٹھو سب بات بتاتا ہوں ایک پان بنوا لاؤں" کہہ کے وہ چلا گیا اور عمران علی بھیڑ میں چائے والے کی دکان سے دور کھڑا کھڑا تمام باتیں سوچتا رہا۔ بہت دیر ہو گئی تب وہ پان لے کر آیا "پان کھاؤ۔ بنچ پر چلو، میں پیشاب کر کے ابھی آتا ہوں" یوں کہہ کر وہ چلا گیا اور طرح طرح کے خیالات میں الجھا گیا۔ عمران بنچ کے پاس آیا تو وہاں صرف برقع پوش خاتون کو دیکھا (کیونکہ وہ ویسا ہی برقعہ اوڑھے ہوئے تھی جیسا کہ

جواب ملا۔

"کیوں بیٹے مُنہ کیوں سیکوڑا" ماں نے کراہتے ہوئے لڑکے سے پوچھا۔

"ماں کپڑوں میں بہت بڑی مٹی آگئی ہے جان سی نکل رہی ہے پیروں کی نسیں کھنچ رہی ہیں۔ ماتا جی اب میں بچوں گا نہیں تیرے وہ روپے بھی بیکار گئے۔" ماں نے اس کے مُنہ پر ہاتھ رکھ دیا جیسے گھوسن ہنڈیا کا منہ چپّن سے ڈھک دیتی ہے۔ ماں اُس کے مُنہ سے اس طرح کی دل شکن باتیں سننا نہیں چاہتی تھی وہ ہاتھ ہٹاتے ہی پھر بولا" ماں آخری بار بول لینے دو یہ بولتی خود بخود بند ہو جائے گی۔ تمہارے ہاتھ رکھنے کی ضرورت بھی نہیں رہے گی۔ دیکھو پھلیا کو بتا دینا کہ بھیا پولیس میں بھرتی ہو گیا ہے پانچ سال بعد لوٹے گا تو تیرے لئے کھلونے بیٹھا اور اچھے اچھے کپڑے لائے گا۔ میرے مرنے کے بعد میری بہن بہت ہی روئے گی۔ تم اسی طرح بہلا دیا کرنا میں اپنی بہن کے لئے کچھ بھی نہ کر سکا۔"

کہتے کہتے وہ چُپ ہو گیا۔ ماں اس کے چہرے کو دیکھ رہی تھی ہاتھ سر پر پھیر رہی تھی۔ چہرے پر مُردنی چھاتی چلی جا رہی تھی۔ جیسے ہی اس کا بولنا بند ہوا اس کی گردن ماں کی ٹانگ سے نیچے لٹک گئی۔ ڈاکٹر کی ساری باتیں جھوٹ ثابت ہوئیں۔ وہ چیخ پڑی۔ اس کی سانسیں رُک گئی تھیں، آنکھیں پھر گئی تھیں۔

"سیوا سیوا میرے پُوت تم چلے گئے۔"

سیوا کی خاموشی نے ماں کی ساری شنکاؤں کا جواب ایک خاموشی سے دیدیا۔ وہ ہاہا کار کر رہی تھی پڑوسنیں بھی دھیرے دھیرے ماتم میں شریک ہو گئیں پھلیا کو کوئی پڑوسن جب تک اس کا سنسکار نہ ہو جائے بہلانے کے لئے اپنے گھر لے گئی۔

گھر کا چراغ گُل ہو گیا تھا۔ شاخ پر ایک ہی پھول تھا وہ بھی گُل چین نے توڑ لیا۔ شام کو ہمسائے رسم کے مطابق اپنے اپنے گھروں سے روٹی لائے پھلیا سنبھال

عمران علی کی بیوی نے اوڑھ رکھا تھا) پوچھا کہ "وہ بچے والی عورت کہاں گئی؟"
برقع پوش عورت نے ہاتھ کے اشارے سے بتایا کہ وہ چلی گئی۔ "جانے دو ایسی عورتیں جو بغیر مردوں کے سفر کرتی ہیں بھلی نہیں ہوتی ہیں۔ عورت عالم ہو یا فاضل۔ طاقت ور ہو یا کمزور اسے تنہا کبھی نہیں جانا چاہئے۔ عورت کو مرد کے سہارے کی ہر جگہ ضرورت ہوتی ہے۔

عمران علی نے اپنی دھن میں یہ سب کچھ کہتے ہوئے معاً کہا چلو! باہر ہوٹل پر چائے پئیں گے۔ وہیں بیٹھیں گے ابھی کچھ وقت اور یہیں بتانا ہے دودھ اور چائے راستے میں ملے یا نہ ملے" اس آدمی کا ذکر کئے بغیر ہی عمران نے اس عورت کو اپنی بیوی سمجھتے ہوئے کہا تو اس برقع پوش عورت نے پاؤں سے سینڈل اتار کر چار پانچ علی عمران کے دھر دیں اور لگی پولیس پولیس چلانے۔

سپاہی آس پاس ہی گھوم رہے تھے مار دھاڑ دیکھ کر فوراً آدھمکے اور عمران کو دبوچ لیا۔ "کیا بات ہے" عورت سے پوچھ۔ تو برقع پوش عورت نے بگڑ کر کہا۔ "کہ جان نہ پہچان یہ صاحب مجھے ہوٹل پر چائے پلانے کی دعوت دے رہے ہیں اور مجھے چھیڑ رہا تھا" سپاہی نے عمران کے پانچ چھ تھپڑ مارے اور مضبوطی سے اس کا ہاتھ پکڑ کر تھانے کی طرف چل پڑا۔

بے چارہ عمران چیختا رہا کہ میں نے اپنی بیوی کے دھوکہ میں اس عورت سے ایسا کہا کیوں کہ میری بیوی بھی ایسا ہی برقع پہنے ہوئے تھی"

مگر پولیس والوں نے ایک نہ سنی آس پاس بیٹھے مسافروں نے بھی یہی کہا کہ "اپنی بیوی کے پہچاننے میں دھوکہ کیسے ہو سکتا ہے" "یہ مکار ہے، لچا ہے غنڈہ ہے اس کی خوب مرمت ہونی چاہئے، حالانکہ عمران کی بیوی اغوا کی جا چکی تھی۔ عمران کو چیختے چلاتے حوالات میں ڈال دیا گیا اور کسی نے کچھ نہ سنی جیسے ذبح ہونے جانے والے جانور کی کوئی نہیں سنتا۔ ادھر جیپ دوڑتی چلی جا رہی تھی چار آدمیوں نے روشن آرا کو جیپ میں چاقو کی نوک پر لٹا رکھا تھا وہ تو نہ معلوم

اس بے چاری کے ساتھ کیا کیا جاتا وہ تو قدرت نے خیر کی کہ ریلوے کراسنگ کا پھاٹک بند تھا۔ خدا کو جس کی عزت بچانی ہوتی ہے وہ سو طریقے نکال دیتا ہے جیپ پھاٹک پر رک گئی جس سے غنڈے گھبرا گئے اور انہوں نے روشن آراء کے منہ میں رومال ٹھونس دیا اور سارا زیور اتار کر اپنی جیب میں رکھ دیا اور روشن آراء جو منہ میں رومال ٹھونسے جانے سے نڈھال پڑی تھی اس کو ریلوے لائن پر ڈال دینے کی اسکیم سوچی گئی۔ غنڈوں کے ایک ساتھی نے اس کی مخالفت کی۔ مگر باقی تین ہم خیال تھے اور اسے اٹھا کر لے گئے چوتھا بے چارہ ساتھی دیکھتا رہا۔ اور جیسے دل میں سوچ رہا تھا کہ زیور چھیننے کے بعد اس حسینہ کو مارنا نہیں چاہئے۔ اور دل ہی دل میں نادم ہوتے ہوئے خدا کے حضور دعا کر رہا تھا کہ اے کل جہان کے مالک بے شک میں اس جرم میں ان ظالموں کا ساتھی ہوں مگر میرے مولا تو اس مظلوم عورت کی جان بچالے وہ دل ہی دل میں اس ہولناک منظر کا تصور کر رہا تھا جب ریل کے وزنی پہیے اس حسین عورت کی بوٹی بوٹی اڑا دیں گے۔ وہ اس خوفناک تصور سے کانپ رہا تھا اور اپنے مولا سے دل ہی دل میں گڑگڑا کر کہہ رہا تھا کہ اے سب کو بچانے والے کوئی فرشتہ بھیج کر اس عورت کی جان بچالے اتنے میں اس کے تینوں ساتھی اس عورت اور اس بچے کو عین پٹری کے درمیان رکھ کر واپس آچکے تھے اور دور سے ریل گاڑی کے انجن کا دھواں بتا رہا تھا کہ بہت کم وقت میں گاڑی آیا ہی چاہتی ہے جیپ اسٹارٹ ہو گئی اور بیک گیر میں ڈال کر اسے پیچھے کی طرف کر کے کسی دوسرے راستے سے بھاگ نکلے۔ ریلوے کراسنگ کا چوکیدار اپنے کیبن سے بیٹھا یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ بجائے اس کے کہ وہ آرہی گاڑی کو ہری جھنڈی دکھاتا وہ بھاگ کر گیا اور ریل کی پٹری میں پڑی اس عورت کو اٹھا کر اپنے کیبن میں لے آیا۔ غنڈوں کا چوتھا ساتھی جیپ میں مڑ مڑ کے دیکھتا جاتا تھا اس نے چوکیدار کو حسینہ کو ریلوے لائن سے اٹھاتے ہوئے دیکھ لیا تھا جس سے اسے بڑی خوشی ہوئی زیور میں حصہ ملنے یا خیریت سے بھاگ نکلنے

کی نہیں بلکہ اپنی دعا مقبول ہو جانے کی اور اس حسینہ کی جان بچنے کی۔ چوکیدار نے عورت کو کیبن میں رکھنے کے بعد ہری جھنڈی دکھائی اور آنے والی گاڑی آناً فاناً میں پاس ہو گئی۔ تبھی گشت سے واپس آ رہے کچھ سپاہی اس کے کیبن میں گھس گئے۔ "کیوں بھئی تم نے ہری جھنڈی دکھاتے دکھاتے اندر کیوں رکھ دی تھی اگر کوئی ایکسیڈنٹ ہو جاتا تو کیا ہوتا۔ کس کے حکم سے تم نے ایسا کیا ہے؟"

"اس عورت کو لائن پر سے اٹھائے لایا ہوں۔ یہ زندہ ہے کچھ غنڈے اسے لائن پر ڈال کر بھاگ گئے ہیں" عورت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"جھوٹ بولتے ہو تم نے اس عورت کو کیبن میں بند کر لیا ہے اور اس کے منہ میں کپڑا بھی ٹھونس دیا ہے تاکہ یہ شور نہ مچا سکے اور تم اپنی من مانی کر سکو اور اس کو لائن پر ڈال دو۔ ہمیں بہکاتے ہو۔" ایک سپاہی نے کہا اور اسے پکڑ کر لے گئے۔

عورت کی ڈاکٹری ہوئی۔

چوکیدار کو حوالات میں ڈال دیا گیا۔

عمران علی اور سگنیلر۔

دونوں کے بیچ حوالات کی صرف ایک ہی دیوار تھی۔

امتحان

ابا جان آپ اپنے چمن سے کسی کو بھی پھول توڑنے نہیں دیتے مگر ابھی ابھی جو پنڈت جی گئے ہیں ان کو آپ نے منع کیوں نہیں کیا جب کہ وہ ہر روز پھول توڑ کر لے جاتے ہیں،، ڈاکٹر افتخار حسین کے لڑکے نے شکایتی لہجے میں اپنے باپ سے کہا۔

بیٹے اس کی کئی وجوہ ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ ہمارے پڑوسی ہیں دوسرے وہ صرف پانچ ہی پھول توڑتے ہیں۔ تیسرے یہ کہ ان پھولوں کو وہ ایک مقدس کام کے لئے لے جاتے ہیں۔"

کون سے مقدس کام کے لئے ؟

"مندر میں بھگوان کو چڑھاتے ہیں۔"

"کیا پھولوں کے بغیر پوجا نہیں ہو سکتی ؟"

"ان کا ایسا ہی خیال ہے۔"

"جب دنیا میں پھول نہیں تھے تو یہ لوگ پوجا کیسے کرتے تھے ؟"

"پھول ہی دنیا میں پہلے پیدا ہوئے انسان بہت بعد میں۔"

"اچھا ابا جان یہ بتائیے میں نے کہیں پڑھا ہے کہ بھاگیرتھ جی نے پوجا کر کے گنگا جی کو آسمان سے اتارا تھا۔ پھر وہ شیو جی کی جٹاؤں میں سما گئی تھیں۔ بعد میں ان کی بھی پوجا کی گئی تو شیو جی نے جٹائیں نچوڑ دیں اور گنگا بہنے لگیں۔۔۔۔۔۔

ابھی بات پوری نہیں ہوئی تھی کہ باہر سے آواز آئی۔

"ڈاکٹر صاحب آج ٹہلنے نہیں چلنا ہے؟" وہ ان کے بے تکلف دوست قدرت اللہ تھے۔

"آج بچے کی وجہ سے دیر ہو گئی، معاف کیجئے گا" ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا اور چلتے چلتے انہیں اپنے بیٹے کی تمام باتیں سنا دیں۔

"بچے تو کبھی کبھی بڑی عجیب باتیں پوچھ لیتے ہیں۔ کل میرا لڑکا اخبار پڑھتے پڑھتے بولا "ابو گاؤں والوں کو شہر والے گنوار کیوں کہتے ہیں؟

"کیوں کہ شہری لوگ اپنے آپ کو دیہاتیوں سے زیادہ مہذب، تعلیم یافتہ ہوشیار اور چالاک سمجھتے ہیں" میں نے بیٹے کو جواب دیا تو وہ بے ساختہ بولا "آپ نے آج تک کسی بھی گاؤں میں ہندو مسلم فساد کا کوئی واقعہ اخبار میں پڑھا ہے یا کسی سے سنا؟"

"کبھی نہیں" میں نے کہا۔

"کیا کبھی کسی گاؤں میں کرفیو لگتے سنا؟"

"بالکل نہیں بیٹے" میری بات سنتے ہی وہ اخبار ایک طرف رکھتے ہوئے بولا "اس پر بھی یہ شہری لوگ اپنے آپ کو مہذب کہتے ہیں؟"

ڈاکٹر صاحب، اپنے لڑکے سے یہ باتیں سن کر میں تو بالکل خاموش ہو گیا کوئی جواب ہی نہ بن پڑا مجھ سے۔"

دونوں باتیں کرتے کرتے اس دوکان پر پہنچے جہاں سے وہ سویرے سویرے پان کھا کر ہی ٹہلنے نکلتے تھے۔ "ہاں بھئی رام نواس" ڈاکٹر صاحب کے اس ادھورے جملے کا پورا مطلب سمجھتے ہوئے رام نواس نے عاجزی کے ساتھ کہا "جی حضور ابھی بناتا ہوں" یہ کہہ کر اس نے جلدی جلدی ہاتھ چلانے شروع کر دئے۔

"ویشنو ہوٹل کا کیا مطلب ہوتا ہے ڈاکٹر صاحب؟" سامنے ہوٹل پر لگے سائن بورڈ کو پڑھتے ہوئے قدرت اللہ نے پوچھا۔

"ایسا ہندو ہوٹل جس میں مانس وانس نہیں پکتا ہو"

"مگر میں نے تو دیکھا ہے کہ گوشت خوروں کے لئے یہ دوسرے ہوٹلوں سے

گوشت لاکر سرد کر دیتے ہیں۔"

"یہ دوکان داری کی باتیں ہیں۔" سامنے سے آتی ہوئی ایک حسینہ کو دیکھتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے قدرت اللہ کو ہنس کر ٹال دیا۔ قدرت اللہ بھی ٹھٹھکا وہ بھی ادھر ہی دیکھنے لگا۔ لیکن اس نے ڈاکٹر صاحب کی توجہ اس طرف سے ہٹانے کے لئے چٹکی بھی لی "ڈاکٹر صاحب اس پنواڑی کی دوکان پر جو بندو کا فوٹو لگا ہے یہ اس سے زیادہ حسین ہے"

"ہاں ہاں مگر آپ لوگ تصویر کا ایک ہی رخ دیکھتے ہیں۔" اسی دوران وہ حسینہ قریب آگئی۔ اور آن کی آن میں آگے بڑھ گئی۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو ڈاکٹر صاحب اسی لئے تو پرسوں اُس پیشنٹ کو اندر کمرے میں لے گئے تو پھر کافی دیر تک باہر نہ آئے۔"

"کون سا پیشنٹ؟"

"جس کی گود میں ایک چھوٹا سا بچہ تھا۔ جب وہ باہر نکلی تو مسکرا رہی تھی تم بھی بہت خوش تھے یاد آیا؟۔

"دیکھو قدرت بھائی ویسے تو سب آنکھوں سے دیکھتے ہیں مگر نظر میں فرق ہوتا ہے۔ وہ عورت اپنے بیمار بچے کو لائی تھی میں نے اسے مناسب دوا دیدی اور کچھ دوائیں بازار سے خریدنے کو بھی لکھ دیں جو اس وقت میرے پاس نہیں تھیں اور کہہ دیا جب کل تم آؤ تو یہ دوائیں بھی لیتی آنا میں ان کا طریقۂ استعمال سمجھا دوں گا جب وہ صبح آئی تو میں نے ترکیب استعمال سمجھاتے سمجھاتے جو اُس کے چہرے پر نظر ڈالی تو مجھے اس کی ناک بغیر پھول کے دکھائی دی جب کہ اس کی ناک میں کل سونے کا پھول تھا۔ آج اس کی جگہ جلد پر گورا گورا پھول کے برابر نشان تھا جو پھول کے نیچے ڈھکا رہتا تھا اور ایسا لگ رہا تھا جیسے پکے ہوئے اُپلے کے نیچے سے دوب گھاس نکل آئی ہو۔ میں کئی باتیں سوچتا رہا کہیں کھو گیا یا کسی نے چھین لیا مگر میں کسی نتیجے پر نہیں پہنچا اور میں یہ جاننا بھی چاہتا تھا کہ

وہ پھول کہاں گیا۔ آخر کار میں اسے اندر لے گیا اور اس سے بولا "بیٹی تو مجھے اپنے باپ کی جگہ سمجھ اور جیسے ایک بیٹی اپنے باپ سے کچھ نہیں چھپاتی ہے تو بھی مت چھپا۔ میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ وہ سونے کا پھول کہاں گیا؟ یہ سن کر اس نے بڑے معصوم انداز سے میری طرف دیکھا اور نظریں جھکا کر بولی "اسے سور وپے میں گروی رکھ کے دوا میں لے آئی"

یہ سن کر میں نے اس کی پیٹھ تھپتھپائی اور کہا "بیٹی یہ تو تو نے ٹھیک ہی کیا جو غریبی میں زیور گروی رکھ کر کام چلا لیا اور قرض کی دیمک سے بچ گئی اب ایک کام کر" میں نے سو کا نوٹ جیب سے نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "یہ لے اور ادھر سے جاتے ہوئے اس پھول کو چھڑا لینا کل جب دوا لینے آئے تو پھول پہن کر آنا سونی ناک اچھی نہیں لگتی ہے، سہاگ کی نشانیوں کو جسم سے الگ نہیں کرتے ہیں" یہ سن کر وہ سہمی اور ہاتھ پیچھے کھینچ لیا یہ اس کی شرافت اور ایمان داری کی علامت تھی میں نے اسے سمجھایا "بیٹی ہو بچے کو اپنے باپ سے جو بھی ملے خوشی سے لے لینا چاہیئے اسے لینے کا حق بھی ہوتا ہے۔ یہ ساری باتیں اپنے گھر جا کر اپنے شوہر سے بھی بتا دینا تاکہ تم دونوں کے بیچ کسی بھی طرح کا شک نہ جنم لے۔

یہ سن کر وہ مسکرائی، میرے پیر چھوئے اور ہاتھ جوڑ کر نمستے کر کے نوٹ لے کر مسکراتی ہوئی باہر نکل گئی میں بھی اس لئے خوش تھا اور اس روز مجھے محسوس ہوا کہ کسی ضرورت مند کی مدد کرنے میں دل کو کتنی خوشی ہوتی ہے۔ یہ پہلا موقع تھا جو میں نے رمضان کے مبارک ماہ میں ایک اچھا کام کیا"

"سمجھ گیا ڈاکٹر صاحب، معافی چاہتا ہوں میں نے ناحق آپ پر بدگمانی کی ..... رام نواس پان بن گئے کیا؟ قدرت اللہ نے بات ختم کرتے ہوئے کہا۔

"ابھی دیتا ہوں صاحب، میں آپ لوگوں کی باتوں میں پان بنانا ہی بھول گیا"

"تمہیں ہماری باتوں میں کیا مل رہا تھا تم دوکان دار ہو ان باتوں سے کیا لینا..... رام نواس آج تک ہم نے تمہاری ٹانگ کی بابت کچھ نہیں پوچھا

کہ یہ کیسے کٹی؟"

"ڈاکٹر صاحب یہ پوچھ کر کیا کرو گے اس کی بڑی دکھ بھری کہانی ہے" وہ پان لگاتے ہوئے بولا۔ ایک بار میرے گھر ڈکیتی پڑی تھی۔ ٹانگ میں گولی لگ گئی۔ تمام جمشید پور میں دکھایا کسی سے علاج نہیں ہوا آخر کار آل انڈیا میڈیکل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ دہلی میں داخل ہوا اور وہیں سے مجھے لنگڑے کا خطاب ملا یعنی میری ٹانگ کاٹ دی گئی۔ اس وقت میں ابھی پڑھ رہا تھا اور شادی شدہ تھا۔ اگر شادی نہ ہوئی ہوتی تو اتنی محنت مشقت کرنی نہ پڑتی۔"

"تب تو اچھا ہوا تمہاری شادی ہو گئی تھی ورنہ نکمے بن جاتے۔" یہ سن کر وہ مسکرایا۔ "تم کون سی کلاس میں پڑھتے تھے؟"

"بارہویں کلاس کا امتحان دیا تھا ڈاکٹر صاحب میرا نتیجہ آیا تو میری ٹانگ جسم سے جدا ہو چکی تھی۔ میں نے اپنے کالج میں ممتاز حیثیت پائی تھی سب مجھے شاباش دے رہے تھے اور میں تھا کہ رو رہا تھا۔"

"کیوں کہ تمہاری ٹانگ کٹ گئی تھی۔" قدرت اللہ نے کہا۔

"لنگڑے تو کیا پڑھتے نہیں ہیں۔ ملال یہ تھا کہ میری ڈاکٹری کا خواب مٹی میں مل گیا تھا۔"

"کیا تمہارے پاس بوٹنی بایولوجی تھی؟"

"جی۔" رام نواس شکستہ ہو کر بولا۔

ڈاکٹر صاحب پان کا بیڑا ہاتھ میں لئے نہایت سنجیدگی کے ساتھ کھڑے کھڑے سوچ رہے تھے کہ اتنے ہونہار تو وہ بھی نہیں تھے۔ قدرت اور قسمت بھی منہ دیکھ کر انصاف کرتی ہے۔ یہ سوچتے ہوئے پان منہ میں رکھتے ہوئے چل دئے۔

"ڈاکٹر صاحب ذرا ٹھہرئیے۔ یہ لیتے جائیے" رام نواس نے کہا۔

"کیا ہے؟" ڈاکٹر صاحب نے متعجب ہو کر پوچھا۔

"پرسوں جس لڑکی کو آپ نے بھتو کا فوٹو دیا تھا وہ میری بیوی تھی۔"

اس نے آپ کی شرافت اور انسانیت کا سارا قصہ مجھے سُنا دیا تھا اچھا ہوا اس وقت آپ آگئے ورنہ میں اسی کے ہاتھ یہ روپے آپ کے اسپتال میں بھجوا دیتا۔ آپ کی غریب پروری کا بہت بہت شکریہ۔"

"غریبی کوئی مصیبت نہیں ہے جو اس کے آگے گھٹنے ٹیک دیئے جائیں یہ تو ایک امتحان ہے اور ایمان والے اس کا مقابلہ کرتے ہیں۔ برکت اپنی ہی کمائی میں ہوتی ہے ڈاکٹر صاحب۔"

قربانی

"ابے اُلّو کے پٹھے! ادھر آ سالے ڈھینکلی ہی چلاتا رہے گا۔"

"آگیا سرکار کیا حکم ہے"، کسان نے نہایت انکساری سے دست بستہ کہا مگر اس بدمعاش کے لئے یہ شریفانہ فقرہ دستخطوں کے نیچے کھینچی گئی لکیر کی طرح بے کار ثابت ہوا۔

"دیکھ بے۔ ہمارے پیچھے پولیس پڑی ہوئی ہے تو اس لڑکے کو اپنی کٹیا میں چھپا دے۔ ہم لوگ پولیس کو چکمہ دے کر ادھر لوٹ آئیں گے اور وہ ہماری کھوج میں آگے نکل جائے گی بس پھر ہم اس بکرے کو لے جائیں گے، سمجھے؟" کہتے ہوئے بدمعاش نے جھونپڑی کے اندر لڑکے کو ڈھکیل دیا اور مونچھیں مروڑتے ہوئے آگے کہا "غداری مت کرنا ورنہ کنبے کا نام و نشان مٹا دوں گا۔"

"بہت اچھا سرکار"، لمبے لمبے قدموں سے جاتے ہوئے بدمعاش سے کسان نے کہا۔ وہ اُچھل کر گھوڑے پر چڑھا اور فرار ہو گیا۔

"کیا کہہ رہا تھا؟"، کیاری میں پانی چلتا چھوڑ کر کسان کی بہو نے قریب آ کر پوچھا۔

"بدمعاشوں کا سردار معلوم ہوتا ہے اس لڑکے کو چھپا گیا ہے۔" لڑکے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس نے کہا۔

"کیوں بیٹے تم ان کے چنگل میں کیسے پھنس گئے؟"

سنبھال کر اندر رکھتی رہی۔ "آؤ ماتا جی خوب مزے سے پیٹ بھر کر روٹی کھالو۔ اگر بھیا پولیس میں بھرتی نہ ہوتا تو وہ بھی ہمارے ساتھ خوب مزے سے کھاتا۔" پھلیا نے ہنستے ہوئے ماں کے گلے میں ہاتھ ڈال کر کہا۔

"ایسی روٹی بھگوان کسی کو نہ کھلائے۔" ماں نے اداسی سے کہا۔

پھلیا "ایسی روٹی بھگوان کسی کو نہ کھلائے" کئی بار من ہی من دہراتی رہی۔ مگر چپ رہی اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ ماں بھوکی رہنے کو اچھا کیوں سمجھتی تھی، اچھی خاصی روٹی ملی تو اس سے نفرت کیوں کر رہی ہے۔

"یہ مجھے اسکول سے آتے ہوئے اٹھا کر لے آئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ میرے باپ سے پھروتی میں موٹی رقم وصول کریں گے اور اگر وقت پر رقم ادا نہ کی گئی تو میرا خون کر دیں گے" کانپتے ہوئے لڑکے نے کہا۔ وہ کسان کو اور اس کی بیوی کو قابلِ رحم حالت میں کھڑا گھر ا دیکھ رہا تھا آنکھوں سے آنسو برس رہے تھے۔

کسان کا دل پسیج گیا اور وہ ہمت بندھاتے ہوئے بولا: "تم رو مت میں تم کو تمہارے باپ کے پاس پہنچا دوں گا"

"کیسے"، لڑکے نے پوچھا۔

"تم اندر بیٹھو، ہم کوئی ترکیب سوچتے ہیں"

"تم اس لڑکے کے بچاؤ کے ساتھ ساتھ اپنی جان بچانے کا طریقہ بھی سوچ لو۔ یہ لوگ بڑے ظالم ہوتے ہیں۔ پھولن دیوی کے کارنامے اور ڈہیلی گاؤں پر ڈھائے گئے ظلم و ستم یاد کرلو۔ ان کے پاس دیا دھرم نہیں ہوتا ہے جس نے قانون ہاتھ میں لے لیا اس کے ہاتھ سے شرافت چھوٹ جاتی ہے ایک ہی چیز تو رہ سکتی ہے ہاتھ میں۔ یہ جلدی ہی لوٹے گا اور لڑکا نہ پاکر ہم دونوں کو مار ڈالے گا۔

"تم صحیح کہتی ہو، مگر ہم ایک اچھا کام کرنے کی سوچ رہے ہیں اور ایشور اچھے کام کا اچھا پھل دیتا ہے۔ وہ دیکھتا نہیں ہے کیا؟"

"وہ دیکھتا تو دن رات محنت کرنے والا کسان دانے دانے کو محتاج رہتا اور کوٹھیوں والوں کی کھتیاں اناج سے بھری رہتیں"؟ دھرماتما ستائے جاتے اور ظالم موج کرتے؟"

"بحث کا وقت نہیں ہے جس کام کو دل کہے اس کو ضرور کرنا چاہئے۔ نتیجہ جو بھی ہو ایشور پر چھوڑ دینا چاہئے" کہتے ہوئے کسان سڑک کی طرف دیکھنے لگا جیسے دکھ سے بیزار کوئی رات بھر جاگنے والا پورب کو دیکھنے لگتا ہے۔

حسنِ اتفاق سے اسی وقت دو جیپیں آتی ہوئی نظر پڑیں اور اس نے

اپنے ڈنڈے پر سر سے صافہ اُتار کر اس کے ہولے پر باندھ کر اونچا اٹھا کر لہرانا شروع کر دیا۔ اب وہ خیالات کے تانے بانے سے بالکل دُور تھا اور ارجن کی طرح سمجھ آنے کے بعد کرم بھومی میں اُتر پڑا تھا۔ آتی ہوئی پولیس نے ادھر دیکھ کر موقع کا جائزہ لیا اور اس اشارے کو کوئی بھی جنگل فریب نہ سمجھ کر جیپیں قریب لا کر روک دیں۔

"جلدی ادھر آؤ"، کسان نے جیپ میں سے باہر جھانک کر دیکھتے ہوئے سپاہی سے کہا۔ وہ باہر نکلا، ادھر دوڑا۔ اور پاس آکر بولا "کیا بات ہے"

"آؤ بیٹے جھونپڑی سے باہر نکل آؤ"، کسان نے پوشیدہ لڑکے سے کہا وہ جلدی سے باہر آگیا جیسے اولے کی چوٹ کھائے ہوئے پانی سے اٹھا بلبلہ سطحِ آب پر رُونما ہوتا ہے۔

"کیا آپ لوگ اسی کی ٹوہ میں ہیں؟"

"ہاں ہاں۔ یہ تمہیں کیسے ہاتھ لگا، وہ کدھر گئے"؟ سپاہی نے جلدی جلدی بات پوری کی۔

"وہ گروہ تمہارے ہاتھ نہیں لگے گا گھوڑوں پر سوار ہے۔ کار اور گھوڑے کا ساتھ کیا وہ بہت دُور نکل چکا ہے، تم اس بے چارے کو لے جاؤ اور اپنا کام کرو"

"کیا بکواس کرتا ہے۔ پولیس کی ہمت شکنی کرتا ہے، بدمعاش سے ڈر گیا جو اس کا فیور لے رہا ہے"

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں صاحب۔ میرے کہنے پر عمل کرو اور ایک کام اور کرو"

"کیا؟" تیور چڑھاتے ہوئے سپاہی نے سوال کیا۔

"اس وقت ہمیں بھی یہاں سے چلو ورنہ یہ لوگ ہمیں زندہ نہیں چھوڑیں گے"

"تم کیسی باتیں کرتے ہو ان کو ہمارے آنے کا پتہ ہے اور پولیس جس علاقے میں ہو نکل جاتی ہے غنڈے وہاں سے بیساکھ کی ملن کی طرح سے ہوا ہو جاتے ہیں تمہارے پاس کوئی بھی نہیں پھٹکے گا"۔ بے پرواہی سے اس کی باتوں کی تہہ میں پہنچے بغیر

ہی سپاہی نے کہا۔ یہ سُنتے ہی کسان کا چہرہ انٹرویو میں فیل اُمیدوار کی طرح پیلا پڑ گیا، اس نے جھنجھلا کر کہا۔

"چھوڑیے ان باتوں کو۔ بدمعاش پولیس کی آنکھوں کے سامنے گھومتے پھرتے ہیں اور پولیس کو ان کی پہچان بھی نہیں ہوتی اس خاکی وردی پر اتنے مغرور کیوں ہوتے ہو ذرا سی دیر میں کرکری ہو جاتی ہے۔"

"تم گھبراؤ مت ہم کوشش کر کے بار تم دونوں کو یہاں سے لے چلیں گے۔" دوسرے سپاہی نے جھوٹا سہارا دیتے ہوئے کہا اور کسان کو کچھ راحت ملی۔ وہ بولا بھگوان نے کچھ سُنی تو۔"

"کچھ بھی نہیں سُنی یہ پولیس کس کی میت ہوئی ہے جو تمہاری ہو گی اپنا کام نکالنے تک یہ لوگوں کے پیٹ میں گھس جاتی ہے کام پورا ہوا اس نے آنکھیں دکھائیں۔ تم نے لڑکے کی جان تو بچالی یہ تو دھرم کمالیا مگر اب اپنی سوچو میرا دل تو یہ کہتا ہے کہ یہاں سے بھاگ چلو" بیوی نے کہا۔

"عورتیں کاٹرتا کی بات کرتی ہیں، ہم نے پولیس کی مدد کی ہے، اس کے ساتھ احسان کیا ہے وہ اس احسان کے بدلے میں ہمیں ضرور لے چلے گی اور ہماری حفاظت کرے گی۔"

"پولیس؟ اور تمہاری حفاظت کرے گی وہ اپنی ٹوپی تو سنبھالے۔ مان جاؤ۔ بھاگ چلو۔ مجھ کاٹر کا کہا ہی مان لو۔ کہیں کہیں بھاگ جانا بھی بہادری ہوتا ہے۔ دس کے سامنے اکیلے کو کٹ مرنا کوئی بہادری نہیں ہوتی ہے، بیوقوفی ہوتی ہے۔ میرا دل دھڑک رہا ہے چلو جلدی چلو سوچو مت۔" بیوی نے خیالوں میں کھوئے ہوئے شوہر کو جھنجھوڑتے ہوئے کہا اور ایک ہاتھ پیٹ پر پھیرنا شروع کر دیا جس میں بچہ آخری اچھل کود مچا رہا تھا۔

"کیوں بے حرام زادے ہمارے شکار کو کر دیا داماد وں کے حوالے غداری سے باز نہیں آیا،" دونوں کے پیچھے سے ایک کھردری آواز آئی۔ پیچھے مڑ کر

دیکھا تو وہی بدمعاش بندوق سنبھالے مونچھیں مروڑ رہا تھا اس نے چاقو نکالا دس بارہ انچ چمچماتے پھل والا اور ان دونوں کی طرف بڑھا۔

"ہماری روزی چھیننے کی سزا بھگتنے کے لیئے تیار ہو جاؤ" اس نے چہرہ بھینک کر بناتے ہوئے کہا۔ "ویسے تو میں گولی سے مارتا مگر اس کی آواز سے پولیس کے کتے ادھر ہی بھاگ آئیں گے اس لئے چاقو ہی استعمال کروں گا۔ تم نے تو اسے بچا لیا اب خود کو بچاؤ" دانت کٹکٹاتے ہوئے اس نے آخری الفاظ کہے اور لپک کر کسان کے پیٹ میں چاقو کا پھل اتار دیا اور وہ بہتے ہوئے پانی کے پار چھپے پر گر گیا اس کے پیٹ سے خون نکل کر پانی میں مل گیا اور بہتا ہوا کیاری تک پہنچ گیا جس سے تمام کیاری سرخ رُو ہو گئی اس کی بیوی نے یہ دیکھ کر کھرپے کی طرف قدم بڑھائے لیکن ابھی وہ کھرپے تک پہنچی بھی نہ تھی کہ ڈول سے ٹھوکر کھا کر گر گئی اور بدمعاش نے آگے بڑھ کر اس کا گلا کاٹ دیا وہ تڑپنے لگی اور اس بے کلی اور بیزاری میں اس کا بچہ بھی پیٹ سے باہر نکل آیا جیسے زبان کھانسی کی شدت سے منہ سے باہر نکل آتی ہے۔

پولیس کچھ دور تک ان لوگوں کا پیچھا کرتی رہی لیکن وہ ان لوگوں کو پکڑنے میں ناکام رہی۔ اندھیرا ابھی بڑھتا جا رہا تھا اس لئے سب کے سب لوٹ آئے پولیس شکی ہوتی ہے اس کے دماغ میں آیا کہ ہو سکتا ہے اسی کٹیا میں وہ بدمعاش آ چھپے ہوں اس لئے سب کے سب آ کر یہیں رک گئے کچھ لوگ جیپ سے باہر نکلے اور اس کٹیا کے پاس گئے مگر وہ خالی پڑی تھی انہوں نے کٹیا کے مالک کو ڈھونڈا تو وہ دونوں زمین پر مرے ہوئے پڑے پائے عورت کی دھوتی میں بچہ رو رہا تھا کلبلا رہا تھا انہوں نے دھوتی میں سے بچہ کو نکالا وہ ٹھیک ٹھاک تھا تندرست تھا خوب صورت تھا فوراً نال کاٹا اور نوٹ لیا اور مالا کی آدھی دھوتی پھاڑ کر اسی میں لپیٹ کر کار کی طرف چل دیئے۔

"یار اگر ہم ان کو اسی وقت یہاں سے لے چلتے تو ان کی جانیں نہیں جاتیں۔ کسان نے صحیح کہا تھا۔" ایک سپاہی نے چلتے چلتے پچھتاتے ہوئے کہا۔

"ہم نے دُنیا کی جان بچانے کا ٹھیکہ لے رکھا ہے کیا؟ جس کی جان بھگوان نہ بچا سکا اس کی جان ہم ہی کیسے بچا تے؟" دوسرے سپاہی نے جواب دیا۔

"یہاں بھگوان انسان کے کام نہیں آیا تو کوئی بات نہیں لیکن انسان کو تو انسان کے کام آنا چاہئے۔ ہم اس امتحان میں فیل ہو گئے۔ اس نے اتنی بڑی قربانی کی اور ہم فرض بھی پورا نہ کر سکے۔ تمہیں بھلے ہی اس کا ملال نہ ہو مگر مجھے تو بہت ہی دُکھ ہے۔"

"مرنے سے ڈرنا۔ مرنے کا ملال کرنا سپاہی کے دھرم میں شامل نہیں ہے۔ سپاہی کو رحم و کرم کی ضرورت نہیں ہے ظالم بننے کی ضرورت ہے دھرم کرم کی باتیں کرنے کو تو دھرم گرو ہی کافی ہیں۔" دوسرے سپاہی نے کہا۔

"انسپکٹر ہنڈ کران لاشوں کا تازہ خون یہ ثابت کر رہا ہے کہ وہ لوگ کہیں آس پاس ہی چھپے ہوئے ہیں اور ہم پر گھات لگا کر حملہ کر سکتے ہیں۔ پتہ ہے کھسیانی بلّی کھمبا کریدتی ہے۔ جلدی چلو ورنہ جوان کا حال ہوا ہے ذہی اپنا بھی ہو سکتا ہے۔" جیپ کی طرف بڑھتے ہوئے سپاہی نے کہا اور دونوں چل پڑے جب جیپ کے پاس پہنچے تو پولیس انسپکٹر نے پوچھا "یہ کہاں سے لے آئے"؟ تب سپاہی نے ساری رام کہانی سنائی۔

"یہ کیسے دو گے؟" انھوں نے پھر کہا۔ ابھی کسی نے صحیح جواب تلاش نہیں کیا تھا کہ سب سے پہلے کملیشور (اُٹھایا ہوا لڑکا) بول پڑا۔

"یہ مجھے دیدیجئے۔ میں اس کو اپنی ممّی کو دے دوں گا وہ اس کو پال لیں گی ہمارے گھر میں اس وقت کوئی چھوٹا بچہ بھی نہیں ہے۔ ظالموں نے اس کسان کے خاندان کو مٹانے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی لیکن بھگوان کو اس کا نام چلانا تھا۔ وہ میاں بیوی جنہوں نے ہماری رکشا کی اور خود قربان ہو گئے تو کیا ہم ان کی

آخری نشانی کی حفاظت بھی نہیں کر سکیں گے۔ جہاں میں ہوں گا وہاں یہ بھی رہے گا۔ میں اس کو بھائی کا پیار دوں گا کیا آپ اس کے ماتا پتا کا ایک ایک فوٹو مجھے نہیں دے سکیں گے؟"۔

"ضرور دیں گے بیٹے" پولیس انسپکٹر نے کہا۔

سب لوگ ساہو صاحب کے گھر خیریت سے پہنچ گئے۔ ساہو صاحب نے خوش ہو کر سب کو انعام دیا پولیس اس بچے کو اور فوٹو دے کر چلی گئی۔

ایک مہینہ تو ہنسی خوشی بیت گیا۔ ساہو صاحب اپنے لڑکے کی بہت نگرانی رکھتے تھے۔ ایک نوکر اس کو اسکول لے جاتا تھا اور اسکول سے ساتھ لاتا تھا پھر بھی ایک دن کملیشور کو گولی مار دی گئی۔

"غنڈوں نے ایسا کیا ہے وہ چھٹ گئے ہیں"، پوری بستی میں یہی ایک جملہ پرواز کر رہا تھا۔ سارا خاندان غم میں ڈوب گیا۔ مہینوں تک ملنے والوں کے شوک سندیس آتے رہے لوگ طرح طرح سے سمجھاتے رہے۔ سچ بھی ہے کہ کوئی کسی کے ساتھ مر نہیں سکتا۔ غم دل کو سمجھانے سے ہی ہلکا ہوتا ہے۔ کوئی بھی حالت سامنے آئی مگر اس نوزائیدہ کی پرورش میں کمی نہیں آئی۔ سب اس سے پیار کرتے تھے جبوں کہ اس بچے کے علاوہ پورے گھر میں کوئی بچہ ہی نہ تھا کھلونے کی طرح ہاتھوں ہاتھ رہنے لگا اور ان کے دل بہلانے کا ذریعہ بن گیا دھیرے دھیرے سب اس بچے کو اپنا لڑکا سمجھنے لگے یہی نہیں اس کا نام بھی مرنے والے کے نام پر کملیشور رکھ دیا گیا۔ کچھ لوگوں نے اس بچے کو گود لینے کی رائے بھی دی مگر ساہو صاحب کا سالا اس کے خلاف تھا وہ کہتا تھا۔

"جیجا جی ابھی آپ بوڑھے نہیں ہوئے ہیں اس لئے دوسرے کے بچے کو اپنی جائداد کا مالک کیوں بناتے ہیں؟"۔

ساہو صاحب نے کہا "کیا پتہ زندگی کب دھوکا دے جائے اگر کوئی بچہ ہو گیا تو یہ حقوق واپس لے لوں گا کاغذات میں ایسی کوئی بات لکھ دوں گا"

اس مستقل مضبوط ارادے کے سامنے ساہو کے سالے جگل کشور کی ایک نہ چلی اور بچے کو کوڑے دان سے اٹھایا گیا بچہ مشہور کر کے ساری ملکیت کا مالک بنا دیا گیا وقت کی بات دیکھئے کہ بچے کو گود لینے کے پانچ سال بعد ساہو صاحب کی اہلیہ حاملہ ہوگئی اور سالے کی بات بن آئی اور وہ جگہ جگہ اپنی پہلی باتوں کو دہراتا پھرتا رہا۔ ساہو صاحب اب خاموش تھے اور ہارے ہوئے جیتا کی طرح کچھ نہیں کہتے تھے وقت پورا ہوا اور ایک لڑکی نے جنم لیا۔

تیس سال کی عمر میں کملیشور پیدا ہوا تھا گیارہ سال کا ہونے پر اسے قتل کر دیا گیا اس کی موت کے پانچ سال بعد یہ لڑکی پیدا ہوئی اس طرح اب ساہو صاحب کی عمر چھبیس سال کی ہو گئی تھی۔ دل کے ارمان تو ایسی چیز ہیں کہ کسی بھی عمر میں کسی بھی حالت میں سائے کی طرح آدمی کے ساتھ رہتے ہیں لیکن اولاد پیدا ہونے کی امید کمزور نظر آنے لگی تھی اس لئے انہوں نے سالے کے کہنے کے مطابق لڑکی کو وارث نہیں بنایا اور کملیشور ہی کو مالک بنا رہنے دیا اور سارا پیار اسی پر انڈیل دیا۔ لڑکا کبھی ہونہار نکلا ہر سال اچھے نمبروں سے پاس ہوتا چلا گیا یہی نہیں ایک اچھے بیٹے کے تمام گن اس کے اندر موجود تھے اور یہی تمام خوبیاں اس کی حفاظت کا کارن بنیں۔ پھر بھی جگل کشور اپنی بھانجی گیتا کو پوری ملکیت کا مالک بنانے کی فکر میں رہتا تھا ان کی اسکیم کامیاب ہوئی یا نہیں لیکن وہ سازش سے باز نہیں آئے۔

ایک دن جگل کشور نے ساہو صاحب سے کہا "میں گیتا کو آپ کی جائداد کا مالک بنانا چاہتا ہوں یہ کملیشور کو کیسے معلوم ہو گیا۔

ساہو صاحب اس کے بنا وٹی سوال کا جواب دینے ہی والے تھے کہ پاس بیٹھا جگل کشور کا دوست بول پڑا "بس تم اسی بات پر تعجب کر رہے ہو مجھے تو ایک ایسی بات کا پتہ چل گیا جو کسی کو بھی معلوم نہ ہو وہ ساہو صاحب کی جائداد کا مالک بننے کے لئے ساہو صاحب کے قتل کی تیاری کر رہا ہے"

"کیا کہہ رہے ہو؟ وہ تو ساری ملکیت کا مالک ہے ہی پھر مجھے مارنے کی کیوں سوچے گا؟"۔

"یہی سوچ کر تو میں تعجب میں پڑ گیا مگر جب اس نے مجھ سے اپنا منشا ظاہر کیا تو میں اصلیت کی تہہ کو پہنچا کہ اس کو شک ہے کہ آپ کسی بھی وقت اس کے حقوق اس سے چھین کر لڑکی کے نام کر سکتے ہیں میں نے اسے جھوٹا سہارا بھی دے دیا ہے تاکہ وہ اور کہیں کسی سے نہ مل سکے۔ میں آپ کے کانوں میں یہ بات ڈالنے کو کئی روز سے سوچ رہا تھا مگر موقع نہیں مل رہا تھا یہ لڑکا تو آستین کا سانپ ہے ساہو صاحب! کسی دن آپ کی لڑکی کو بھی بیچ دے گا۔ دیکھتے جایئے کہیں پرائے پوت اپنے ہوتے ہوں گے، کہیں پرائے گھر کے دیپ سے اپنے گھر میں اُجالا ہوتا ہو گا اپنا خون اپنا ہی ہوتا ہے۔ آپ نے اسے اپنا بیٹا بنا لیا ہے مگر اس نے آپ کو اپنا باپ بنا لیا ہو یہ ضروری بات نہیں ہے"۔ جگل کشور کے دوست نے کہا۔

اگر یہ بات سچ ہے تب تو وہ سچ مچ کیٹ ہے، گھر میں چھپا ہوا دشمن ہے۔ گھن کی طرح جس لکڑی میں رہ رہا ہے اسی کو کتر رہا ہے۔ ساہو صاحب کے سالے نے نمک مرچ لگایا۔

"بالکل صحیح بات ہے اگر میرے ساتھ ایسی بات ہوتی ہوتی تو میں اس کو ایک منٹ بھی گھر میں نہیں ٹھہرنے دیتا"۔ دوست نے کہا۔

"بات یہ ہے بھئی ساہو صاحب سیدھے ہیں شریف ہیں وہ اسی بھلمنساہٹ کا ناجائز فائدہ اٹھا رہا ہے اگر یہ ذرا بھی ہوشیار ہوتے تو اس کو مال و متاع کا مالک نہ بناتے، لڑکیاں کیا ماں باپ کے گھر نہیں رہتیں؟۔ کتنے لوگوں نے دامادوں کو اپنے گھر رکھ لیا ہے اگر رکھنا ہی تھا اور پوری ہمدردی برتنی تھی تو دس پانچ ہزار روپیہ دے کر کوئی کام شروع کرا دیتے ٹھیک تھا یا نہیں؟ ملکیت کی مالک لڑکی رہتی۔ تھی تو اپنی ہی"۔ جگل نے پھر کہا۔

"مگر سمجھائے کسے یہ اس مٹی کے بنے ہوئے ہیں ہی کہاں جو ایسی باتیں

ان پر اثر کریں۔ مَیں نے بھی کئی بار اشارہ کیا ہے مگر وہی ڈھاک کے تین پات۔ چلو مندر کا سمے ہو گیا ہے جہاں تک آئیں ورنہ پجاری جی کہیں گے کہ اکھنڈ کیرتن میں بھی شریک نہیں ہوئے ویسے یہ تو بیکار کی بکواس ہے۔ اس زمانے میں اور بہتّر گھنٹے کا اکھنڈ کیرتن ہے نہ سب پاگل پن؟ اگر بہتّر گھنٹے کام کیا جاتا تو دیس کا بھی بھلا ہوتا اور اپنا بھی۔ یوں رامائن کی چوپائیوں کو الاپنے سے کیا ہوتا ہے؟ اگر ان کو عمل میں نہ لایا جائے؟"

"ٹھیک کہتے ہو" دوست نے کہا اور دونوں باہر چلے گئے۔

ساہو صاحب خیالات کے سمندر میں غوطے لگا رہے تھے ان دونوں کے الفاظ ان کے دل و دماغ میں ڈی سی کرنٹ کی طرح دوڑ رہے تھے انہیں جسم میں چیونٹیاں سی دوڑتی معلوم ہونے لگیں۔ کان گرم ہو گئے دماغ میں لپ لپ سی ہونے لگی۔ یہ کملیشور جس کو میں نے انگلیوں پکڑ کر پالا ہے اپنی ملکیت کا مالک بنا دیا ہے اُلٹا مجھے قتل کرنے کی سوچ رہا ہے۔ مَیں نے آنگن میں بیر کا پودا لگا دیا، کمینہ کہیں کا، احسان فراموش، بد ذات۔ سچ مچ نیچ قوم سے اونچی بات کی آس رکھنا ہی بھول ہے۔ مَیں اسے جلدی سے گھر سے نکال دوں گا۔ کورٹ جاتا ہوں کاغذی کارروائی خارج کراتا ہوں اس سے تو واقعی اپنی گیتا بیٹی ہی اچھی۔ اب اسی کو مالک بنا دوں گا۔ مجھے جُگل کشور کا کہنا مان لینا چاہیے تھا۔ کبھی کبھی اپنوں کی نصیحت پر عمل نہ کرنا بھی بہت نقصان دہ ثابت ہوتا ہے۔ اچھا ہوا بھگوان نے جلدی آنکھیں کھول دیں" کہتے ہوئے ساہو صاحب نے بید اُٹھایا اور کورٹ کو چل دئیے۔ اس وقت گینا کسی سہیلی کے گھر گئی ہوئی تھی اور کملیشور بازار۔

"تیر کا ٹھکانہ ٹھیک رہا۔ دیکھو ساہو صاحب پر کیا اثر پڑتا ہے" جُگل کشور نے کہا۔

"بس یا تو یہ چال فوراً کام کر جائے گی یا فیل ہو جائے گی" دوست بولا۔

ساہو صاحب جب کورٹ سے لوٹے تو کملیشور گھبرا چھیلنے کے لئے جا چکا تو

ہاتھ میں لئے ہوئے تھا۔ دیکھتے ہی ان کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ "سچ مچ یہ میرا خون کرے گا" انہوں نے سوچا اور اس کے پاس مرکھنے بیل کو باندھنے کے لئے جانے والے کسان کی طرح ہوشیاری سے گئے۔

"چاقو مجھے دینا"

"لیجئے پتا جی! مگر کیا کریں گے چاقو کا کوئی میرے لائق کام ہو تو بتایئے"

وہ چاقو کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

"تو اس چاقو سے میرا گلا کاٹنے کی کوشش میں ہے میں تیرا پتا کاٹوں گا"

"پتا جی! یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟"

"نیچ کمینے! پتا جی کہتے ہوئے شرم محسوس نہیں ہوتی مجھے دیکھ" الماری سے پولیس کا دیا ہوا نوٹ نکال کر اس کے سامنے پٹکتے ہوئے ساری کہانی سنانے کے بعد بولے۔

"اصلیت یہ ہے پہلے جو بتا رکھا تھا وہ من گھڑت کہانی تھی میں نے تجھے پال پوس کے اتنا بڑا اسی لئے کیا تھا کہ کیکر کے پیڑ کی طرح تو مالک ہی کی ٹوپی اتارے میرا گلا کاٹنے گا تو۔ نکل جا میرے گھر سے نیچ کہیں کے۔ کتے کی دم۔ سانپ کو کتنا ہی دودھ پلاؤ وہ زہریلا ہی رہتا ہے"

ساہو صاحب۔ میرے ماتا پتا نے آپ کے لڑکے کی جان بچانے کے لئے اپنی جان دے دی اور آپ مجھے کمینہ بتا رہے ہیں۔ اگر آپ کی نگاہ میں ایسے آدمی نیچ ہیں، کمین ہیں تو میری نظر میں ایسے لوگوں کے احسان کو بھولنے والا نیچ اور کمین ہے مجھے آپ کی جائیداد نہیں چاہئے۔ کہتے ہوئے اس نے فوٹو اٹھا کر ماتھے سے لگائے اور سنبھال کر جیب میں رکھ لئے اور پھر کہا۔ "یہ شان و شوکت، عیش و آرام پیسے پیسار کے بغیر سب بیکار ہیں آپ نے جو تعلیم دلائی ہے اگر یہ واپس کی جانے والی چیز ہوتی تو میں اس کو بھی آپ ہی کو دے جاتا۔ میں آپ کی دولت سے الگ ہو کر بھی مزدوری کر کے جی لوں گا لیکن آپ اس دولت سے الگ ہو کر دو پیسے کی مزدوری بھی نہیں کر سکیں گے۔ ساہو صاحب! سکھوں میں پلا ہوا جسم محنت مزدوری کرنے

نیم حکیم

"کھٹ کھٹ کھٹ کھٹ" کواڑ کھٹکھٹانے کی آواز آئی اور زبیدہ نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا "آیئے"۔

"کواڑیں بند کئے دیتا ہوں تم اندر چلو" کریم بولا۔

"آپ تھکے ہارے آئے ہیں کیا میں کواڑ بھی بند نہیں کر سکتی"۔

"مکان تو تمھاری صورت دیکھتے ہی ختم ہو جاتی ہے"۔ کواڑ بند کرتے ہوئے کریم نے کہا۔

"میری صورت وکس کی ڈبیا ہے کیا؟"۔

"میرے لئے تو ایسا ہی ہے" کہتا ہوا کریم زبیدہ کے پیچھے پیچھے آیا اور صحن میں پڑی کھاٹ پر "یا اللہ تو ہے" کہتا ہوا دراز ہو گیا۔ "زبیدہ ایک بات تو بتاؤ" ماتھے کا پسینہ پونچھتے ہوئے کریم نے کہا۔

"پوچھئے"۔ زبیدہ نے قریب آکر کہا۔

"میں نے جیسے ہی کنڈی کھٹکھٹائی تم نے کواڑ کھول دی۔ پوچھا بھی نہیں کہ کون ہو۔ اگر کوئی غیر آدمی ہوتا تو؟"

"غیر آدمی ہو ہی کیسے سکتا تھا" زبیدہ نے کندھا مسوستے ہوئے یقینی انداز میں کہا۔

"تمھارا دروازہ راشٹرپتی بھون کا گیٹ تھوڑے ہی ہے"۔

اس کو قبول نہیں کریں گے جب کہ مسلمانوں میں اس کے بالکل برعکس ہے، لہذا گوپی نے مسلمان بننے کے لئے امام صاحب سے سانٹھ گانٹھ لگائی، تاریخ طے ہوگئی، جب گوپی کے بڑے بھائی کو اس کا علم ہوا تو اس نے گوپی کو آڑے ہاتھوں لیا، ایک مسلمان لڑکی کے پیار میں اندھے کتے مرجا کہیں جا کر مگر پیار کی خاطر دھرم بدلنا بری بات ہے۔ اس سے بستی کی بدنامی ہے خاندان کی ناک کٹتی ہے، جاتی کو نیچا دیکھنا پڑے گا، بھائی کے سامنے تو اس نے کچھ نہیں کہا مگر رات کو افیون کھا کر سو گیا اور ایک پرچہ لکھ کر سرہانے رکھ دیا، کہ میں اس دنیا کو چھوڑ کر جا رہا ہوں جس میں مذہب محبت کو محدود کرتا ہے تم پیار کرنے سے روک سکتے ہو مگر مرنے سے تو نہیں روک سکتے۔ میری آخری خواہش پوری کر دینا یعنی مجھے دیوؤں کے استھان کے پاس سرسوں کے کھیت کے کونے میں پھونک دینا"

مُرادن کو جب اس کا پتہ چلا تو اس کی زبان گُنگ ہوگئی، مگر جب صُبح کو اسے مُردہ پایا گیا تو اس کے سرہانے کے نیچے سے بھی ایک پرچہ ملا جس پر لکھا تھا کہ میں تو تیا کھا کر اپنے گوپی کے پاس جا رہی ہوں لہذا مجھے بھی وہیں دفنانا جہاں گوپی کو جلایا ہے۔ اس کی وصیت اس کے بڑے بھائی نے پڑھ کر پرچہ پھاڑ دیا اور تجہیز و تکفین کے انتظام میں لگ گیا جب اس کا جنازہ اُٹھانے لگے تو وہ اتنا وزنی تھا کہ کئی آدمی مل کر بھی نہ اٹھا سکے۔ لوگ حیرت زدہ تھے۔ جب سب تدبیریں بے کار ثابت ہوئیں تب اس کے بھائی نے اس کی آخری خواہش سب کے سامنے رکھی جو ایک مُشکل کام تھا لہذا گاؤں کے معزز ہندوؤں کو بُلایا گیا اور انہیں مُرادن کی آخری خواہش کے بارے میں بتایا گیا اور یہ بھی بتایا گیا کہ وہ خود ایسا کرنا نہیں چاہتے مگر تمام کوششوں کے باوجود جنازہ اُٹھتا ہی نہیں۔ ہندو حضرات نے صاف الفاظ میں انکار کر دیا کہ جہاں گوپی کی چتا جلائی گئی وہاں مُرادن کی قبر نہ کھودی جائے۔ جب یہ ہندو حضرات واپس ہوئے تو سب کے سب مُرادن کے گھر سے نکلتے ہی اندھے ہوگئے اور بڑی مُشکل سے گرتے پڑتے اپنے گھروں میں پہنچے جب ان کی آنکھوں کی روشنی نے واپس آنے کا

نام تک نہ لیا تو آخر کار ہندوؤں نے یہ فیصلہ کیا کہ مُرادن کی قبر گوپی کی کریا پر بنانے کی اجازت دے دی جائے شاید سب کی آنکھوں میں پھر سے روشنی آجائے لہٰذا مسلمان بھائیوں کو بُلایا گیا اور انہیں اس کی اجازت دی گئی کہ وہ ایسا کر سکتے ہیں تو مسلمانوں اور ہندوؤں کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ سب ہندوؤں کی آنکھوں کی روشنی واپس آگئی۔

مُرادن کی آخری خواہش پوری کی گئی اور اس طرح ایک قبر میں یہ جوڑا دفن ہوا یہ کہہ کر لڑکا چُپ ہو گیا۔

آپ اپنے مزار کو خوبصورت بنوانا کیوں پسند نہیں کرتے؟ میرے اس سوال پر لڑکے نے مسکراتے ہوئے کہا کہ ہم شاہ جہاں تھوڑے ہی ہیں اور نہ ہی محبّت نمائش چاہتی ہے۔ مگر آپ کا مزار بہتر انداز میں بنوانے سے اس یادگار کے بارے میں ہر کسی کو پتہ چل سکے گا اور عوام کو کچھ عقل تو آئے گی۔ اس پر اس لڑکے نے بڑے طنزیہ انداز میں کہا کہ جس دُنیا کے عوام کو گیتا، بائیبل اور قرآن اور گرو گرنتھ صاحب عقل نہ سکھا سکے اور مذہب کی دیواروں میں قید ہونے سے نہ بچا سکے انہیں میرے مزار کی اینٹیں کیا سکھائیں گی۔ لڑکے نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ محبّت اور خدا دُنیا کے ہر مذہب سے پہلے موجود تھے مگر دُنیا والے نہ تو محبّت کو سمجھتے ہیں اور نہ مذہب کو، محبّت کو ہوس اور مذہب کو وسیلۂ فساد سمجھ لیا گیا ہے حالاں کہ محبّت ہی خدا ہے اور مذہب صرف اور صرف اپنے معبود کی عبادت کرنے کے مختلف طریقوں کا نام ہے۔ یہ کہتے ہوئے اور میرے دیکھتے دیکھتے وہ دونوں بغل گیر ہو گئے اور مختصر ہوتے ہوتے کھجور کے تنے میں سماتے چلے گئے

٭ ٭ ٭

عرضِ ناشر

اُردو افسانہ اور ناول اب فحاشی کی حد تک عشقیہ اور سفلیہ انداز اختیار کر چکا ہے۔ کیوں کہ پڑھنے والے اپنی تہذیب، شرافت اور انسانیت کی قدروں کو قابلِ افسوس حد تک فراموش کر چکے ہیں۔ پہلے لکھنے والوں کے سامنے کوئی نہ کوئی مقصد ہوتا تھا اور وہ اپنے افسانوں یا ناولوں میں کوئی نہ کوئی ایسا پیغام دیتے تھے جسے پڑھنے والا اپنی زندگی کے لئے مشعلِ راہ سمجھتا تھا۔ مگر اب جنسی بے راہ روی کے آئینہ دار افسانے اور ناول انتہائی فحش اندازِ تحریر لئے ہوئے نئی نسل تو نئی نسل بڑے بوڑھوں کے لئے بھی باعثِ تسکینِ دلِ ناداں بن رہے ہیں اور گئودان، بیوہ، واردات، پریم پچیسی ایسے ناول اور افسانوں کے مجموعے صرف نصابِ تعلیم (جو محض نام کا ہی نصابِ تعلیم ہے) یا پھر کسی کسی لائبریری کی الماریوں میں گرد میں اٹے پڑے ہیں۔ مخربِ اخلاق افسانوں اور سفلی جذبات کو جھوٹی تسکین دینے والے ناولوں کے لکھنے والے مصنف اور انہیں چھاپنے والے ناشرین کو محض روپیہ کمانے کی فکر ہے ان کی بلا سے کسی نوجوان کا اخلاق تباہ ہوتا ہے یا کوئی ناکتخدا نوجوان ایسی تحریروں کو پڑھ کر جنسی بے راہ روی کا شکار ہوتا ہے راقم الحروف ایک ایسے ناشر کو جانتا ہے جس کی شائع کی ہوئی فحش افسانوں کی کتابیں پڑھ کر اس کی اپنی بیٹی کسی افسانوی ہیرو کے ساتھ فرار ہو گئی تھی۔

اگر موجودہ دور کے افسانہ نگاروں اور ناول لکھنے والوں نے ہمارے مُلک کی موجودہ حالت کے مطابق قومی یک جہتی، ہندو مسلم بھائی چارہ — حُبُّ الوطنی، دیہاتی سادگی، ایمانداری اور مہذّب انداز کے افسانے اور

ناول لکھنے کی طرف توجہ نہ دی تو وہ دن دُور نہیں جب ہمارے ہاں یورپ سے بھی زیادہ بے راہ روی اور ذہنی انتشار پھیل جائے گا اور ہماری تہذیبی و تمدنی قدریں ختم ہو جائیں گی۔

"ماں سروَر" جناب ڈاکٹر اُودے سرن ارمان کے ایسے اکتیس افسانوں کا مجموعہ ہے جو ہمارے مُلک کی تہذیب، تمدن، شرافت اور انسانیت کو اُجاگر کرتا ہے۔ ان افسانوں کو پڑھ کر منشی پریم چند کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹر ارمان نے صحیح طور پر منشی پریم چند کے اندازِ فکر، دیہاتی سادگی، گاؤں میں ہندو مسلمانوں کا پیار بھرا بھائی چارہ، حُبُ الوطنی، انصاف و سچائی کا ساتھ دینے، عورت کی عزت کرنے، جھوٹ نہ بولنے، اور دوسرے کی عزت کو اپنی عزت سمجھنے کو زندہ کیا ہے۔ اور اس قسم کے مقصدی افسانے لکھ کر جہاں اُردو افسانے کو مالا مال کیا ہے وہاں اس دَور کے افسانہ نگاروں کے لئے بھی ایک راستہ متعین کیا ہے کہ جس پر انہیں چل کر اپنے مُلک کی خدمت کرنی ہے۔

کاش ہمارے یہاں کی اُردو اکاڈمیاں فحش اور فنی اعتبار سے غلط کتابوں کو انعامات سے نوازنے کی بجائے ماں سروَر جیسی کتابوں کی حوصلہ افزائی کرتیں۔

سروَر تونسوی

ایڈیٹر شانِ ہند۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

۵ رجولائی ۱۹۸۲ء

"آپ بھی بڑے بھولے بنتے ہیں۔ آپ کے ڈیوٹی سے آنے کا وقت ہے اس وقت کوئی غیر آدمی کواڑ کھٹکھٹا کے اپنی چاند کو جوتوں سے سہلانے کی دعوت دے گا کیا؟"

"بُری نیت سے آنے والے لوگ تو سو باتیں سوچتے ہیں۔"

"ٹھیک کہتی ہو۔ مان گیا تمھاری بات کو" آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے اس نے پھر کہا "زبیدہ تم بہت دیر سے لالٹین کے پاس بیٹھی بیٹھی کیا سوچ رہی تھیں۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ کواڑوں کی دراز سے مجھے جھانک رہے تھے۔ ٹک چھپ کے دیکھنے سے کیا ملتا ہے کئی سال شادی کو ہو گئے دیکھنے سے من نہیں بھرا۔"

"سوال پیچیدہ ہے جواب زبان کے بس کا نہیں آنکھیں دے سکتی ہیں۔" مسکراتے ہوئے ایک آنکھ میچ کر کریم نے کہا وہ کچھ رُک کر پھر بولا۔

"تم مجھ کو باتوں میں مت اُلجھاؤ اپنی خاموشی کا سبب بتاؤ۔ میں یہ پوچھ کر ہی مانوں گا۔"

"جب کوئی بات ہی نہیں ہے تو بتاؤں ہی کیا۔"

"یہ ایک قدرتی بات ہے کہ آدمی خاموش نہیں رہ سکتا کبھی دُنیا سے بات کرتا ہے کبھی اپنے دل سے بات کرتا ہے جب کوئی بات سوچی جا سکتی ہے تو بتائی بھی جا سکتی ہے۔"

"ٹھیک ہے پہلے کھانا کھا لیجئے گا پھر بتا دوں گی۔"

"اور کسی کو بھوک نہ لگ رہی ہو تو۔"

"کیا کہیں دعوت کھا کر آ رہے ہیں جو بھوک نہیں لگ رہی ہے۔" کمر سے لگے ہوئے کریم کا پیٹ دباتے ہوئے زبیدہ نے کہا۔

"اری زبیدہ! دعوت تو اس کو کھلائی جاتی ہے جس سے چار کام نکلتے ہیں۔ ہم لوگ کس کھیت کی مُولی ہیں۔ جلدی بتاؤ کیا سوچ رہی تھیں۔"

"آپ ہر بات میں ضد کیا کرتے ہیں ایک عورت اپنے گھر گرہستی کے علاوہ

ارمان سرور

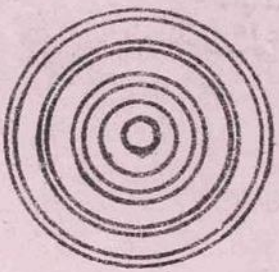

ارمان بلاروی

اور کیا سوچ سکتی ہے۔ نیزا (ایک میلہ) آنے میں کل پانچ روز باقی ہے۔ کب بچوں کے کپڑے آئیں گے۔ کب سلیں گے ہماری تو کچھ نہیں ہے پرانے دھرانے ہی صاف کر کے پہن جائیں گے مگر بچے کیا جانیں کس کے گھر برات آئی ہے۔ ان کی بلا سے کوئی غریب ہو یا کسی کی تنخواہ نہ ملی ہو۔ ان کو تو اپنی خوشی پوری ہونے سے غرض ہوتی ہے۔ اصل میں یہ وقت ان کی خوشی پوری ہونے ہی کا ہے۔ بڑے ہو کر تو وہ بھی ہماری طرح گھر گرہستی کی کیچڑ میں پھنس جائیں گے۔"

"زبیدہ یہ باتیں سوچنے کو تو میں ہی بہتیرا ہوں میرے ہوتے ہوئے تم ایسی باتیں کیوں سوچتی ہو۔ جو شخص اپنے افکار کو عملی جامہ نہ پہنا سکے اس کا سوچنا ہی بیکار ہے۔ کیوں سوچ سوچ کر کایا کو گھلاتی ہو۔"

"معلوم ہوتا ہے آج تنخواہ مل گئی ہے تبھی باتوں میں کچھ گرمی ہے۔"

"زبیدہ تنخواہ نہیں ملی ہے کیشیئر چھٹی پر ہے۔ وہ بیمار ہے۔ اس کی بیماری سے سیٹھ جی کی چاندی ہو گئی ہے۔ سات دن کے بعد آئے گا تب تک سیٹھ جی کے خوب وارے نیارے ہو جائیں گے۔"

"ایک خزانچی کی بیماری ان کے حق میں کیا بھلی ثابت ہو گی۔"

"تم نہیں جانتیں زبیدہ اس کے نہ ہونے سے لاکھوں روپیہ تنخواہ میں بٹنے سے رہ جائے گا اور سات روز تک بینک میں اس کا کتنا سود سیٹھ جی کو مل جائے گا اگر وہ بیمار نہ ہوتا تو یہ سود سیٹھ جی کو کیوں ملتا۔"

تب تو یہ لوگ جان بوجھ کر بھی تنخواہ دیر سے بانٹتے ہوں گے ہو سکتا ہے خزانچی کی بیماری بھی ایک بہانہ ہو اسے بھی راز چھپانے کے لئے چھٹی دیا ہو گا۔"

"اکثر ایسا ہی ہوتا ہے۔ یونین والے کچھ شور مچاتے بھی ہیں تو سیٹھ جی ان کو بھی ٹکڑا ڈال دیتے ہیں اور حق کی بات دب جاتی ہے۔"

"مزدور یونین مزدور کے حق میں بھی بُرا کرتی ہے۔"

"لوہے کو لوہا ہی کاٹتا ہے۔ اکثر باڑھ ہی کھیت کو کھا جاتی ہے" کہتے کہتے

کریم کا گلا بھر آیا۔ زُبیدہ اس کا اصلی راز نہ سمجھ سکی اور کچھ دوسری ہی وجہ سمجھتی رہی۔ "لو یہ روپے رکھ لو بچوں کے کپڑے آجائیں گے اور میلے سے پیشتر سلوا بھی دوں گا" کریم نے سنجیدگی سے کہا۔

"یہ اکیانوے ہیں" وہ گِن کر بولی "کپڑوں کا انتظام تو ہوگیا جُوتے رہ گئے۔"

"جوتوں کا بھی خدا حافظ ہے۔" گھڑی سنبھالتے ہوئے کریم نے کہا "مَیں باتوں ہی باتوں میں یہ پوچھنا بھول گئی کہ آپ کی سائیکل کہاں گئی۔"

"اگلے پہیے میں پنچر ہوگیا تھا دُکان پر چھوڑ آیا ہوں۔"

"رات کے نو بجے کون سی دُکان کُھلی ملی آپ کو۔"

"تم جانتی ہو یہ مشین کا زمانہ ہے یہاں رات دن کام ہوتا ہے۔ تم سوچ رہی ہو کہ تمھارے بچے ننگے پیر ہی میلا دیکھنے جائیں گے۔"

"نہیں مَیں یہ نہیں سوچ رہی ہوں۔ مَیں آپ کے ہوتے ہوئے کچھ نہیں سوچوں گی پھر جو اپنے افکار کو عملی جامہ نہ پہنا سکے اس کو کچھ بھی سوچنا نہیں چاہیئے۔" زُبیدہ نے کریم کا جملہ دہرایا۔

"بس تو یہی مَیں چاہتا ہوں۔ اب لاؤ کھانا۔"

"بہت اچھا" زُبیدہ کھانا لینے چلی گئی۔ وہ بظاہر خوش نظر آرہی تھی مگر دل و دماغ میں ایک اضطراب تھا "لیجئے کھانا حاضر ہے۔" کھانا سامنے بڑھاتے ہوئے اس نے کہا۔

"مَیں اکیلا ہی کھاؤں گا" مصنوعی مُسکان کے ساتھ اس نے کہا۔

"مَیں بنا بھوک کے کیسے کھالوں۔" کریم کے الفاظ دُہراتے ہوئے بولی۔

"مَیں سمجھ رہا ہوں تمہاری بھوک نہ ہونے کی وجہ۔"

"کیا سمجھ رہے ہو۔"

"یہی کہ تم کھانا کم بچنے کی وجہ سے خود بھوکی رہ کر میرا پیٹ بھرنا چاہتی ہو۔ اگر ایسا بھی ہے تو کوئی بات نہیں ایک روٹی تم کھالو ایک مَیں کھالوں گا۔ غریب تو جینے کے

لئے کھاتے ہیں رئیس کھانے کے لئے جیتے ہیں۔ جس روز بھارت کے غریبوں کو پیٹ بھر کر روٹی ملنے لگے گی اُس روز یہ مُلک جنت نما بن جائے گا۔" زُبیدہ کا دامن پکڑتے ہوئے کریم نے کہا۔ زُبیدہ اپنی ہار مان گئی اور کھانے میں شریک ہو گئی ایک روٹی ہلکی سی اور چھوٹی پیاز اس نے اٹھائی اور بھاری سی روٹی اور بڑی پیاز کریم کی طرف بڑھا دی۔ کریم یہ دیکھ کر مُسکرایا۔ دونوں خوشی خوشی کھانا کھا رہے تھے۔ "کیا آج کملا کی شادی ہے" کریم نے لقمہ چباتے ہوئے رُک کر پوچھا۔

"جی ہاں اُس کی آج شادی ہے برات آچکی ہوگی۔"

"لو ہمارے پڑوسی کے گھر شادی ہے اور ہم کو پتہ بھی نہیں۔"

"رئیسوں کی شادی بیاہ کا پتہ غریبوں کو نہیں ہوتا جب کہ غریب کی شادی کا پتہ رئیسوں کو ہو جاتا ہے" بے پرواہی سے زُبیدہ نے کہا۔

"کیسے" کریم نے لقمہ ہاتھ میں لئے ہوئے حیرت سے پوچھا۔

"غریب جب کوئی کارج کرتا ہے تو قرض لینے رئیسوں کے گھر جاتا ہے۔ اس لئے۔"

"ٹھیک کہتی ہو زبیدہ مگر میں اپنے بچوں کی شادی کروں گا تو کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاؤں گا۔"

"بڑا لقمہ توڑ لو بڑی بات مت کہو غریبوں کو بڑی بات کہنا ٹھیک نہیں ہوتا۔"

"زُبیدہ اس میں بڑی چھوٹی بات کیا ہے میرے پاس جتنا روپیہ ہوگا اتنا ہی خرچ کروں گا۔"

"شادی بیاہ میں ایسا نہیں چلتا ہے تمہارے پانچ بچے ہیں مان لو ایک کی شادی میں ایک ایک ہزار روپیہ بھی خرچ کیا تو پانچ ہزار ہو گئے اور جیسے جیسے بچے بڑھتے جائیں گے خرچ بھی بڑھتے جائیں گے تو کیسے اتنی رقم جوڑ لوگے۔"

"زبیدہ میں نے یہ کچھ سوچ کر ہی کہا ہے۔"

"کیا سوچا ہے کچھ میں بھی تو سُن لوں۔"

"سب باتیں بتانے کی نہیں ہوتی ہیں۔"

"میں پوچھ کر ہی مانوں گی۔" زُبیدہ نے اصرار کیا۔

"پوچھنا ہی چاہتی ہو تو سُنو۔ دیکھو فیکٹری کا یہ قانون ہے کہ اگر کسی مزدور کی ڈیوٹی پر ایک اُنگلی کٹ جائے تو فیکٹری تین ہزار روپے دیتی ہے۔ ایک انگلی کاٹ لوں گا کیا فرق پڑتا ہے۔ شادی سے پہلے تو کچھ دقّت بھی ہوتی اب وہ بھی نہیں ہے چاہے جتنا بھی انگ بھنگ ہو جاؤں تم مجھے چھوڑ کر تھوڑے ہی چلی جاؤ گی۔"

"بہت اونچا خیال ہے آپ کا مُجھ میں تو اتنی اونچی بات سوچنے کی عقل کہاں ہے ہاں اگر ایک دو بچوں کی ماں ہوتی تو یہ کڑوی بات سُننے کو کیوں ملتی۔" اتنا کہہ کر وہ گمبھیر ہو گئی۔

"تم جو کچھ کہہ رہی ہو میں نے بھی کبھی سوچا تھا لیکن موتی لال کی نس بندی کرانے کے بعد مر جانے کی گھٹنا سے میرا دل کانپ گیا اور نس بندی کا خیال ترک کر بیٹھا جب تک اس کی نس بندی نہیں ہوئی پٹواری اور گرام سیوک پیچھے پیچھے پھرتے رہے۔ پرچھائیں کی طرح اس کا پیچھا ہی نہیں چھوڑا اور جب نس بندی ہو گئی اور کیس بگڑ گیا تو کسی نے بیچارے کی مزاج پرسی بھی نہ کی۔ غریب آدمی تھا اُگانے کو گھر میں کچھ تھا ہی نہیں رِجھ بُجھ کر مر گیا۔"

"سینکڑوں ہزاروں لوگ نس بندی کراتے ہیں اسی کا کیس کیوں بگڑ گیا کوئی غلطی کر بیٹھا ہو گا" زبیدہ نے کہا۔

"تم ٹھیک کہتی ہو مگر ایسا کچھ نہیں تھا میری اس سے بات ہوئی تھی وہ کہتا تھا کہ اس نے کسی قسم کی بدپرہیزی نہیں کی مگر نس بندی کے اگلے دن ہی خواب دیکھنے سے اس کی تکلیف بڑھی تھی جو اس کی موت کا کارن بن گئی۔" پیتو

پر تو کسی کا بھی قابو نہیں ہوتا ہے اسی خوف سے میں نے کان پکڑ لئے اور نس بندی کا خیال ترک کر دیا کیوں کہ تم خواب میں بھی آئے بغیر مانتی نہیں اور میں بھی اس معاملے میں کچا ہوں۔" کریم نے مزاحیہ انداز میں کہا جس نے منہ چیرا ہے کھانے کو بھی دے گا۔ پانچ لڑکے ہیں کبھی پانچ بہوئیں بھی آئیں گی گھر بھرا بھرا دکھائی دے گا۔" وہ منہ پھلاتے ہوئے بولا۔

"کبھی کبھی خالی بھی دکھائی دے گا۔"

"خالی کیوں ہوگا پانچ روپیہ بھی فی لڑکا کما کر لائے گا تو پچیس روپے روز کما کر لائیں گے۔ اتنا تو کھایا بھی نہیں جائے گا۔"

"اس وقت کی آمدنی پر نظر ہے خرچ پر نہیں۔"

"تم تو بال کی کھال نکالتی ہو سو جاؤ مجھے تو نیند آ رہی ہے۔" کریم آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا اور اسے خیالوں کی دنیا میں گھومتے گھومتے نیند آ گئی۔

"لو بھئی بچوں کے جوتے بھی آ گئے بڑی پریشان ہو رہی تھیں کپڑے بھی لے آؤں گا شام کو دکھا لینا نیز اپنے بچوں کو۔" کریم نے جوتوں کے ڈبے کھاٹ پر پٹکتے ہوئے کہا۔

"اب آپ اپنے کپڑے اتار دیجئے ان کو صاف کر دوں۔" جوتے سنبھالتے ہوئے زبیدہ نے کہا۔ کریم نے کپڑے اتارنے شروع کئے "گھڑی کہاں گئی" کپڑے اترتے ہی ننگی کلائی کو دیکھ کر زبیدہ نے سوال کیا۔

"خراب ہو گئی ہے" جلدی سے کریم نے بات بنائی۔

"سائیکل کی طرح مرمت کو دیدی ہوگی" زبیدہ طنزیہ انداز میں بولی۔

"جی ہاں" حقیقت کا ناٹک کھیلتے ہوئے کریم بولا۔

"میری قسم"

گھڑی خراب ہونے کا یقین دلانے کے لئے تمہاری قسم کھاؤں گھڑی

تو بڑوں بڑوں کی خراب ہو جاتی ہے زبیدہ" کہہ کریم زبیدہ کے ہونٹوں پر ہنسی لانے کا بہانا بناتا رہا مگر وہ ہنسی نہیں اٹھ کر اندر چلی گئی اور کچھ روپے لا کر اس کے ہاتھوں پر رکھتے ہوئے بولی "لیجئے جوتے پہن آئیے ننگے پیر اچھے نہیں لگتے۔"

"تمہارے پاس اتنے روپے کہاں سے آگئے" کریم مشکوک انداز سے کہنے لگا۔

"بھینس کے گوبر کے اُپلوں کو بیچ بیچ کر جمع کئے ہیں۔" اس کا شک دور کرتے ہوئے زبیدہ نے جواب دیا۔ غریبی اور بے سروسامانی کے عالم میں بچت کا یہ ڈھنگ دیکھ کر کریم بہت خوش ہوا۔ روپے جیب میں رکھتے ہوئے بازار چلا گیا۔ اس کے من میں آیا کہ اگر کسی بہانے سے جوتے پہننے کی بات ٹل جاتی تو یہ روپے بچوں کے کپڑوں کی سلائی اور میلا دکھانے میں کام آسکتے ہیں بہت سوچا لیکن کوئی معقول بہانہ نہیں سوجھا۔ سوچتا بچارتا آگے چلا جا رہا تھا کہ سڑک کے کنارے مہترانی کا اکٹھا کیا ہوا نالی کا کوڑا سامنے آگیا اور اچانک اس ڈھیری پر پیر پڑ گیا۔ جس میں ایک شیشے کا ٹکڑا بھی تھا جو انگوٹھے میں گھس گیا خیالوں کی زنجیر ٹوٹ گئی اور کھمبے کا سہارا لے کر اس نے شیشے کا ٹکڑا نکالا۔ خون بہتا چلا جا رہا تھا، اسی کوڑے کے ڈھیر میں سے کوئی کپڑے کا ٹکڑا ڈھونڈ کر اس نے انگوٹھے پر کس کر باندھ لیا۔ وہ گیند کی طرح چوٹ کھا کر بھی اچھلتا ہوا گھر کو واپس ہو لیا۔

"کیا انگوٹھے میں چوٹ مار لی" لنگڑا لنگڑا کر چلتے ہوئے کریم کو دیکھ کر زبیدہ نے کہا۔

"چوٹ مار لی یا لگ گئی۔"

"جو انگلی کاٹنے کی ہمت کر سکتا ہے وہ چوٹ بھی مار سکتا ہے۔" اس نے اداسی سے کہا "کھٹ کھٹ" دروازہ کھٹکا "کون ہے؟" زبیدہ نے کواڑوں کی دراز سے جھانک کر دیکھا۔

"میں ڈاکیا ہوں خط ہے" کواڑیں ہلاتے ہوئے اس نے جواب دیا۔

"یہ کیسا خط ہے" بیمے کی رسید کریم کے سامنے کرتے ہوئے زبیدہ نے پوچھا۔

"یہ خط نہیں ہے بیمے کی قسط کی رسید ہے یونین کے پریذیڈنٹ نے دس ہزار کا بیمہ کرا دیا تھا اس کی قسط کی رسید ہے ہر ماہ تنخواہ میں سے کچھ جاتا ہے۔ ویسے تو جمع ہوتا نہیں اس بہانے سے کچھ نہ کچھ تو جمع ہو ہی جائے گا۔"

"آپ نے اچھا کیا اب ڈاکٹر کے پاس جا کر انگوٹھے پر پٹی بندھوا آئیے۔ آپ بڑے کائیاں ہیں کہیں اسپتال بند ہونے کا بہانہ بنا کر یونہی مت لوٹ آئیے۔"

"نہیں۔ نہیں پٹی بندھوا کر ہی آؤں گا۔" فوراً چل دیا۔ چوٹ لگے کچھ دیر ہو گئی تھی اب انگوٹھے میں تراٹ بڑھ گئی تھی اسپتال دور تھا ایک حکیم کا مطب پاس ہی تھا اس لئے وہ چلنے کی تکلیف اور ڈاکٹر لوگوں کے زیادہ مہنگے نسخے کے بوجھ سے بچنے کے خیال سے نزدیک ہی حکیم زمرد علی خرانٹ کے یہاں چلا گیا "سلام علیکم حکیم صاحب۔"

"وعلیکم السلام بھائی۔ آؤ ارے انگوٹھے میں کیا لگ گیا۔" حکیم جی نے چشمے کو نیچے جھکا کر جھانکتے ہوئے دُکھ ظاہر کیا۔

"شیشے سے چوٹ لگ گئی ہے صاحب۔"

ارے اتنی گرمی میں یہاں تک آیا ہے گھر ہی کگروندے کے پتّوں کا عرق نچوڑ کر اس پر لگا لیتا چوبیس گھنٹوں میں زخم بھر جاتا پھر بعد کو مرداسین، کتیرا اور جنگال برابر برابر گھونٹ پیس کر ملا کر اس پر باندھتا رہتا چار پانچ دن میں صحیح ہو جاتا چل آ گیا تو پٹی باندھے دیتا ہوں" کہتے ہوئے شیرے کی طرح گاڑھی دوا لحاف کے روڑ پر لپیٹ کر انگوٹھے پر باندھ دی "اجی صاحب میں تو نہیں آ رہا تھا مگر میرے گھر میں جو ہے وہ نہیں مانی اور اسپتال کو بھیج دیا میں اُدھر نہ جا کر اِدھر چلا آیا" کریم پٹی بندھواتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

اچھا ہوا جو اُدھر نہیں گیا ورنہ ڈاکٹر ایک تو سوئی لگاتا کھانے کی دوا

[illegible] آج ہی جھنڈ کر دیتا۔" بوری کے ٹکڑے

لئے دیکھ رہا تھا کہ آن کی آن میں اس کا بایاں ہاتھ ایک طرف چکلی پر جا پڑا اور دو انگلیاں کٹ کر نیچے گر گئیں۔ زمین پر پڑی پڑی انگلیاں مچھلی کی طرح تڑپ رہی تھیں۔ اس نے مشین بند کر دی اور آس پاس کے ورکر جمع ہو گئے اور اس کو اسپتال لے گئے۔ ڈاکٹر صاحب پکچر گئے ہوئے تھے کمپونڈر نے پٹی باندھ دی اور وہ گھر چلا گیا۔

"یہ کیا کر لیا آپ نے" زبیدہ دیکھتے ہی بولی "ابھی تو کسی بچے کی شادی بھی نہیں ہو رہی ہے یہ آپ نے کیا کیا۔" دھیرے سے اس نے کہا کسی نے سنا کسی نے نہیں سنا۔ بچے چیختے چلاتے ہوئے آ گئے۔

"ابا جان کو کیا ہو گیا۔ ابا جان کو کیا ہو گیا" ہر لڑکے کی زبان پر ایک ہی فقرہ تھا "کچھ نہیں مرو بھاگو یہاں سے" غصہ میں زبیدہ نے بچوں کو ڈانٹا۔ کریم کو رات بھر نیند نہیں آئی اور تڑپ تڑپ کر کروٹیں بدلتا رہا۔ جسم اکڑ گیا تھا۔ زبیدہ نے سوچا کسی بھوت پریت کا اثر ہو گیا ہے اس نے بدایوں والوں کی زیارت بولی نیاز کو سوا روپیہ اٹھا کر رکھ دیا۔ کریم کو بڑی تکلیف ہو رہی تھی۔ اس کی تکلیف کا اندازہ اس کے چہرہ پر پڑی سلوٹوں سے صاف صاف لگایا جا سکتا تھا۔ جس وقت زبیدہ بازو میں سوا روپیہ نیاز کا باندھ رہی تھی اسی وقت ایک ورکر آیا "السلام علیکم" اس نے سلام کیا مگر کریم سلام کا جواب نہ دے سکا اور اشارہ ہی سے سلام لیا۔ ورکر یہ دیکھتے ہی بھانپ گیا اور بولا "بھابھی یہ کیا کر رہی ہو ان پر آسیب نہیں ٹیٹنس کا کاروگ سوار ہے۔ فوراً اسپتال لے چلو ذرا سی بھی دیر غضب ڈھا سکتی ہے میں نے کئی لوگ اس مرض میں مرتے دیکھے ہیں۔" یہ سنتے ہی زبیدہ کے ہاتھ پیر پھول گئے اور اس ورکر سے متفق ہو گئی۔ ڈاکٹر شریمن نارائن کے اسپتال لے جایا گیا۔ ڈاکٹر نے دیکھ بھال کر کہا "جس دن اس کے انگوٹھے میں چوٹ لگی تھی اسی دن ساڑھے تین روپے کا ایک ٹیکہ لگنا چاہیئے تھا اب ساڑھے تین سو روپے بھی جان بچا دیں تو بڑی بات ہے فوراً سرکاری اسپتال لے جاؤ۔" یہ کہہ کر ڈاکٹر کرسی پر جا بیٹھا اور دوسرے مریضوں کو دیکھنے لگا۔ یہ لوگ سرکاری اسپتال گئے تو ڈاکٹر نے کہا "سات

آٹھ سو کا خرچہ ہے، ہمت ہو تو پرچہ لکھوں۔"

"پرچہ کہاں کو لکھ رہے ہیں آپ" زبیدہ نے اوڑھنی سنبھالتے ہوئے عاجزی سے پوچھا۔

"بازار کو" جلدی سے ڈاکٹر نے جواب دیا۔

"کیا آپ کے یہاں یہ دوائیں نہیں ہیں۔"

"اتنی مہنگی دوا سرکاری اسپتال کیسے رکھ سکتے ہیں۔"

"سرکاری اسپتال غریبوں کے علاج کے لئے بنے ہیں اور غریبوں کا یہاں علاج نہ ہو تو کہاں جائیں ہمارے پاس تو علاوہ ہمارے جسم کے اور کچھ بھی نہیں ہے ڈاکٹر صاحب ہمیں تو کہیں قرض بھی نہیں ملے گا۔"

"بہن جی ہمارے سامنے ایسا کہنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ سب کی اپنی اپنی مجبوری ہوتی ہے۔ دیکھو تم لوگ اپنا اپنا خون بیچ ڈالو اس کی قیمت سے انجکشن آجائیں گے کچھ یہاں سے مدد کر دیں گے۔" مجبوری اور وقت کا تقاضا کہ سب نے ڈاکٹر کی رائے سے اتفاق کیا اور خون دیا انجکشن آئے اور لگے کچھ راحت کی صورت بھی پیدا ہوئی لیکن رات کے بارہ بجے ایک دورہ پڑا اور کریم رب کریم کو پیارا ہوگیا۔

زبیدہ کی آنکھوں میں آنسو تھے اور کانوں میں اس کے جملے گونج رہے تھے "میں اپنے بچوں کی شادی میں کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاؤں گا۔ غریب جینے کے لئے کھاتے ہیں۔ جس دن غریبوں کو بھر پیٹ روٹی ملنے لگے گی اس دن ہندوستان جنت نما بن جائے گا۔ میرے ہوتے تم کسی بات کی فکر کیوں کرتی ہو۔ جو انکار کو عملی جامہ نہ پہنا سکے اس کو فکر کرنا بیکار ہے۔"

جملہ حقوق بحقِ مصنّف محفوظ

تعدادِ اشاعت	پانچ صد
قیمت	اکیس روپے
ناشر	ماہنامہ شانِ ہند۔ فلیٹ ۸ انصاری مارکیٹ دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲
طباعت	خواجہ پریس۔ جامع مسجد دہلی
سنہ اشاعت	۱۹۸۳ء

اِنسان کادل

سینٹ ایو ڈبلیو ٹو بلیولین نمبر تھری ویسٹ لنڈن میں واقع جوزف ولا کے مالک اور سینٹ میری چرچ کے مالدار پادری کا اکلوتا لڑکا وس کانسن یونی ورسٹی یو۔ ایس۔ اے کا گریجویٹ اور ہندی میں ایم اے۔ مسٹر جان گلوری بلانڈ ہندی میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری لینا چاہتا تھا اور وہ باپ سے اجازت لے کر ہندوستان آیا۔ یہ کام انگلینڈ میں بھی ہو سکتا تھا لیکن ہندوستان میں رہ کر ہندی میں ڈاکٹریٹ حاصل کرنے کی بات ہی دوسری تھی۔

ہندوستان آتے ہی وہ سب سے پہلے ڈاکٹر تربھون چندر شرما ہیڈ آف دی ہندی ڈپارٹمنٹ دہلی یونیورسٹی دہلی سے ملا۔ ڈاکٹر شرما سے اس کی ملاقات لندن ہی میں پہلے ہو چکی تھی جبکہ مسلم کانفرنس میں شرکت کے لئے ڈاکٹر اقبال بھی لندن میں تھے۔ ڈاکٹر اقبال کو ساتھ لئے ڈاکٹر شرما اس کے والد جوسف سے ملنے جوزف ولا گئے تھے۔ اس کے بعد ڈاکٹر شرما متعدد بار جوزف ولا گئے۔ جوزف پنڈت جواہر لال نہرو کے ساتھ ہیرا سکول میں پڑھ چکے تھے۔ مسٹر بلانڈ نے اس واقفیت کی بنا پر ایک عرصے تک ڈاکٹر شرما کے مکان میں اپنا وقت بتایا۔

مسٹر بلانڈ نے ڈاکٹر شرما سے ہندی میں تھیسس لکھنے کے لئے مضمون کا انتخاب کرنے سے پہلے یہاں کے مشہور مذہبی اور تاریخی مقامات کی سیر کرنے کی ٹھانی۔ دہلی سے متھرا اور آگرہ قریب پڑتے تھے۔ سب سے پہلے اس نے انھیں مقامات کا دورہ

کیا۔ کار لے ہی رکھی تھی جس پر ایک ہندوستانی ڈرائیور رکھ لیا تھا۔ متھرا سے آگرہ اور آگرہ سے فتح پور سیکری کو روانہ ہو گئے۔ کار بلند دروازہ کے پاس جا کر رُک گئی۔ مسٹر بلائڈ جیسے ہی کار سے باہر نکلے ایک سات آٹھ سال کا لڑکا قریباً چھ سات ماہ کی لڑکی کو گود میں لئے ان کی طرف بڑھا۔ "کیا ہے الگ ہٹ" ہندی ڈرائیور نے کرخت آواز میں اس کو ڈانٹا۔ مسٹر بلائڈ کو نفرت کا یہ انداز پسند نہیں آیا اور انھوں نے آگے بڑھ کر پیار سے اس لڑکے کو اپنی طرف بُلایا۔ لڑکا قریب آگیا۔ "تم بھیک مانگتے ہو، کیا تمھارے ماں باپ نہیں ہیں؟" بلائڈ نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے سوال کیا۔

"میری ماں مجھے پانچ چھ سال کا چھوڑ کر مر گئی تھی۔ پتا پچھلے سال ایک سیٹھ کی کوٹھی کی پاڑ پر اینٹیں لے کر چڑھتے ہوئے نیچے گر کر مر گئے" اتنا کہہ کر اس لڑکے کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور ہونٹ ہلتے رہ گئے وہ بولنا چاہتا تھا مگر کچھ نہ کہہ سکا گلا رُندھ گیا۔ ڈرائیور ندامت سے ایک طرف دیکھ رہا تھا۔

"تمھارا کوئی بھائی نہیں ہے" مسٹر بلائڈ نے اپنے رومال سے اُس کے آنسو پونچھتے ہوئے پوچھا۔

"میرا کوئی بھی نہیں ہے، میرا بھگوان بھی مر گیا۔"

"تمھارا کوئی نہیں ہے تمھارا بھگوان بھی مر گیا" انھیں الفاظ کو دُہراتے ہوئے کچھ ٹھہر کر مسٹر بلائڈ نے پھر پوچھا۔ "تم نے بھگوان کو دیکھا ہے؟"

"ہاں دیکھا ہے میں پٹتا رہا اور وہ دیکھتا رہا اور جب کہ میں بے خطا تھا تب بھی اس نے میرے ساتھ انصاف نہیں کیا" وہ سُبک سُبک کر بولا۔ بچے کی باتیں بلند دروازہ سے بھی بلند معلوم ہو رہی تھیں۔ مسٹر بلائڈ پسیج گئے اور اس کو اپنی کار کی سیٹ پر بٹھا کر بات چیت کرنے لگے ڈرائیور بھی باتوں میں رس لے رہا تھا۔

"تم کہاں پٹتے رہے اور بھگوان دیکھتا رہا۔"

"بابوجی جب مَیں پانچ سال کا تھا تب میری ماں نے ایک لڑکی کو جنم دیا تھا وہ لڑکی پیدا ہوتے ہی مرگئی یہ بات مَیں اب جانتا ہوں اس وقت میں مرنے جینے کی بات سمجھتا ہی نہیں تھا۔ میری ماں اور میرے پتا دونوں نے مجھے سمجھانے کے خیال سے مجھ کو بتایا کہ لڑکی کو شنکر بھگوان کے چرنوں میں چھوڑ آئے ہیں انھوں نے مانگی تھی اب اس کو بڑے ہونے تک وہی پالیں گے۔ میری عمر کم تھی کچی عقل تھی مان گیا لیکن دل میں انیکوں شک جنم لیتے رہے۔ شنکر بھگوان نے میری بہن کیوں مانگی ہے وہ بڑے ہونے تک اس کو کیوں پالیں گے کیا وہ ہمیں اسے دیکھنے بھی نہیں دیں گے۔ اس طرح کی بہت سی باتیں مَیں سوچتا رہا اور جب میرے ماں باپ دونوں ہی سو گئے تو مَیں چپکے سے اُٹھا اور گھر سے باہر نکل لیا۔ اس موقع کی تلاش میں مَیں بہت دیر سے جاگ رہا تھا۔ سیکری سے باہر سڑک کے کنارے ایک چھوٹا سا مندر تھا جس کو شنکر بھگوان کا مندر کہتے تھے۔ مَیں اندھیرے کی چھاتی چیرتا وہاں جا پہنچا اور بہن کو ڈھونڈنے لگا۔ مجھے میری ننھی سی شندر بہن کہیں بھی نظر نہیں آئی وہاں کوئی آدمی نہیں تھا۔ مَیں نے ہمت سے کام لیا اور بھگوان شنکر کے پیچھے اُچک کر دیکھنے کے لئے شنکر جی کے سر پہ ہاتھ رکھا ہی تھا کہ پیچھے سے پجاری آ گیا "اُلو کے پٹھے مورتی کی چوری کرنے آیا ہے ذرا سا بالک ہے اور اتنا بڑا سا کھاکرتا ہے خوب سکھایا ہے تیرے گروہ کے مالک نے پکڑا جائے تو بالک کہلائے اور نہیں تو مال صاف کر جائے" یوں کہتا کہتا وہ میرے سر ہی پر آ گیا اور خوب پٹائی کی۔ کیا میں بے خطا نہیں تھا؟ "ہاں تُم بے خطا تھے" مسٹر بلانڈ نے تصدیق کرتے ہوئے کہا۔ "تو پھر وہ چُپ چاپ کیوں دیکھتا رہا" اپنے سوال کا جواب سُنے بغیر ہی وہ لڑکا جس کے جذبات جوار بھاٹے کی طرح اُمڈ رہے تھے۔ پھر بولا پجاری نے گھسیٹتے ہوئے کہا "چل تھانے وہاں تیرے گروہ کا پتہ بھی چل جائے گا" باہر سڑک پر ایک میاں بیوی جو پکچر دیکھ کر آ رہے تھے پجاری کو سمجھا بجھا کر مجھے چھڑوایا مَیں گھر آ گیا اور لیٹ گیا غصہ ٹھنڈا ہو گیا تھا مَیں پچھتا کر

رونے لگا خوب رویا ماں باپ دونوں سوئے ہوئے تھے ایک بار میرے تیز رونے کی آواز سے پتا جی چونک پڑے حالانکہ مَیں یہی سمجھ رہا تھا کہ میری آواز تیز نہیں ہوگی۔ اُن کے مُنہ سے نکلا "کیوں بیٹا؟ کیا بات ہے؟ کیوں رو رہا ہے؟" مَیں نے کچھ نہیں کہا روتا رہا اور روتا ہی رہا۔ وہ اُٹھ کر بیٹھ گئے اور وہی باتیں پھر دُہرانے لگے مَیں ابھی چُپ تھا اور سُبک سُبک کر رو رہا تھا اور مَیں اس پریشانی میں تھا کہ کہوں تو کیا کہوں صحیح بات کہتا تو بھی مصیبت آجاتی وہ پُجاری جی کو جا پیٹتے یا پھر مجھے مارنے لگتے تو بنا پوچھے گھر سے باہر کیوں گیا تھا وہ میری خاموشی پر آگ بگولہ ہوگئے اور پٹائی کرنے لگے اب ماں بھی جاگ گئی تھی اُس نے اُن کو ڈانٹا۔

"کیوں رات میں اس کو پیٹ رہے ہو ارے بچّہ ہے کوئی ڈراونا سپنا دیکھا ہوگا چُپ ہو جائے گا بیچارے کو سُلانے سے تو گئے پٹائی چالو کر دی مجھ سے پوچھو کتنی تکلیف اُٹھاتی ہوں اور پھُول کی ایک سنٹی نہیں مارتی خبردار میرے لال کو مارا"

ماں کے یہ الفاظ سُن کر باپ نے پٹائی بند کر دی تو ماں نے مجھے بُلا کر اپنے پاس سُلا لیا اور میری کمر اور سر کے بال دھیرے دھیرے اس طرح سہلاتی رہی کہ بابو جی میری دونوں پٹائیوں کی تکلیف ختم ہوگئی میرا جسم بالکل ہلکا ہوگیا مَیں کب سو گیا پتہ ہی نہیں چلا۔ مگر بابو جی میری ماں کا یہ پیار میرے لئے آخری تھا۔ اُس کو صبح کو بخار آگیا دوپہر کو دورے پڑنے شروع ہوگئے اور شام تک وہ چل بسی" لڑکے کی گود میں چھوٹی بچی رونے لگی اس نے ایک کاغذ میں حلوا سا نکالا اور اس کو چٹا دیا اور مُنہ چلانے لگی اور چُپ ہوگئی۔

"تم نے یہ کیا کھلایا" مسٹر بلائد نے پوچھا۔

"مَیں نے آلو اُبال کر باریک پیس کر چینی ملا رکھی ہے۔ یہی کھلا کھلا کر اس کو پال رہا ہوں"

"یہ بچّہ کس کا ہے؟"

"میونسپلٹی ہال کے سامنے سیڑھیوں پر یہ لڑکی پڑی تھی۔ رو رہی تھی مَیں نے

اس کو اُٹھا لیا کچھ دیر تو مَیں اس کو ہلا ہلا کر چُپ کرانے کی کوشش کرتا رہا مگر اس کی ماں نہیں لَوٹی۔ کئی گھنٹے گذر گئے کوئی نہیں آیا تو اس کا برابر رونا مجھ سے نہ دیکھا گیا اسے اپنے ساتھ لے لیا اور اب تک پال رہا ہوں۔ یہاں آنے والے امیروں سے مانگتا ہوں اور اس کو پالتا ہوں اور خود کھاتا ہوں۔" کہتے ہوئے لڑکے نے اس پر ہاتھ پھیرا پیار کیا۔

"کتنے دنوں کی ہے۔"

"قریب قریب سات ماہ کی ہے بابوجی۔"

"تم جتنے چاہو روپے لے لو اور اس کو مجھے دیدو۔"

"بابوجی میں اس کو بہت دنوں سے پال رہا ہوں مجھے یہ اپنی بہن سی معلوم ہوتی ہے۔ اس کے سہارے میرے دن رات کٹ جاتے ہیں۔ بہن بیچی نہیں جاتی ہے دان دی جاتی ہے۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس دن یہ مجھ سے جُدا ہو جائے گی اسی دن مَیں بھی مر جاؤں گا۔" یوں کہتے ہوئے اس نے آلو کی میٹھی چٹنی اور چٹائی۔

"تمھارا کیا نام ہے؟" خوش ہو کر مسٹر بلائڈ نے پوچھا۔

"پرشوتم۔"

"پرشوتم کا کیا مطلب ہوا" مسٹر بلائڈ نے ڈرائیور سے پوچھا۔

"سر یہ لفظ پرشتم کا بگڑا ہوا روپ ہے۔ اس کا مطلب ہے "پرشوں میں اُتم۔"

"ویری گڈ۔ سچ مچ یہ کسی دن بڑا آدمی ہوگا" مسٹر بلائڈ نے ڈرائیور سے کہا۔ وہ مسکراتے ہوئے پھر بولے "بیٹے تمھارا گھر کہاں ہے دکھلاؤ گے"

"ضرور دکھاؤں گا مگر مَیں وہاں رہتا نہیں ہوں اور نا ہی کبھی وہاں جاتا ہوں۔"

"ایسا کیوں؟"

گھر میں جاتے ڈر لگتا ہے صاحب۔ بالکل سُونا سُونا۔ میں سٹیشن کی بنچ پر

پڑے پڑے رات کاٹ دیتا ہوں" چلتی کار میں سنبھل کر بیٹھتے ہوئے پرشوتم نے کہا
"بائیں کو چلیئے صاب۔ وہ مندر جو دکھائی دے رہا ہے اُسی کے پیچھے پلکھن کا پیڑ
ہے وہ میرے ہی گھر کے سامنے ہے" ڈرائیور نے سب باتیں سمجھ لیں اور کار کو
منزل پر جا کھڑا کیا۔ مسٹر بلائد کار سے اُتر کر پلکھن کے پیڑ کے نیچے چبوترے پر
بیٹھے حقہ پیتے لوگوں سے پوچھنے لگے "کیا یہ گھر اسی لڑکے کا ہے؟"

"ہاں صاب اسی کا ہے" سبھی نے زور سے کہا پھر ایک دوسرے کا منہ
دیکھتے ہوئے کانا پھوسی کرنے لگے "آج کسی انگریز کا سامان پار کر دیا معلوم ہوتا
ہے۔"

"تم لوگوں کے ہوتے ہوئے یہ بھیک کیوں مانگتا ہے کیا تم پڑوسی مل کر اس
کی کوئی امداد نہیں کر سکتے، کچھ کام نہیں دے سکتے۔ اگر تم نے اس کی مدد کی ہوتی
تو یہ بھیک نہیں مانگتا، بھیک مانگنا تو بُری بات ہے۔"

"ابھی یہ کسی کام کے لائق ہی کہاں ہے سرکار جب بڑا ہوگا تو کوئی کام بھی
بتا دیں گے" سب نے مل کر کہا۔

"تم لوگ جب چھوٹے کی مدد نہیں کر سکتے تو بڑے کی کیا مدد کرو گے بڑا تو
خود اپنی مدد کر لیتا ہے مدد تو چھوٹے ہی کی کی جاتی ہے۔ جب بڑا ہوگا تو یہ خود تمھاری
مدد کرے گا۔"

مسٹر بلائد نے کار میں بیٹھنے کا اشارہ کیا اور سیکری کے بازار میں آئے
جہاں سے اس کے لئے کپڑوں کا انتظام کیا اور اس کے بعد قلعہ دیکھا اور دہلی کو
روانہ ہوئے۔

"اب تم ہمارے ساتھ ہی رہا کرو گے" پرشوتم سے مسٹر بلائد نے کہا۔ مسٹر بلائد نے
لڑکے کو پرشوتم کی گود سے اپنے ہاتھوں پر لے لیا۔ غور سے دیکھنا شروع کیا اس کے
ناک نقش خوبصورت تھے تھوڑی پر چھوٹا سا کالا تل بہت اچھا لگ رہا تھا گلے
پر ایک لال تل تھا۔ ایک ہاتھ میں چھ انگلیاں تھیں جنھر کے پاس ایک چھوٹی سی لٹکتی

ہوئی انگلی دیکھ کر مسٹر بلائد کو ہنسی آ گئی۔ ڈرائیور نے سامنے شیشے میں کنکھیوں سے انھیں مسکراتے دیکھا وہ سمجھا کہ وہ اس کی کسی غلطی پر مسکرا رہے ہیں وہ سیٹ پر سنبھل کر بیٹھ گیا اور اسٹیئرنگ سنبھالتے ہوئے اور بھی احتیاط سے گاڑی چلانے لگا۔ مسٹر بلائد خوش خوش ڈاکٹر شرما کے مکان پر دہلی میں آ گئے "یہ دو بچے کس کے ہیں"، ڈاکٹر شرما کے منہ سے نکلا۔

"میرے ہی سمجھ لیجئے۔" سنجیدگی کے ساتھ مسٹر بلائد بولے۔ مسٹر بلائد نے سورداس کے کادیہ میں سائی کولوجی کا کمال طریق اظہار پر تھیسس لکھنی شروع کر دی۔ لڑکی کے لئے ایک دایا رکھ دی اور پرشوتم کو جے۔ ڈی ٹاٹا سکول قرولباغ دہلی میں بھرتی کرا دیا۔ وقت کا پنچھی برابر پرواز کرتا رہا اور وہ لڑکی جس کو چھ ماہ کی لائے تھے اب پندرہ سال کی ہو گئی اور بی اے میں پڑھتی تھی۔ پرشوتم نے ایم اے کر لیا تھا اور بائیس سال کا تھا۔ چندر کا پرشوتم سے بالکل سگے بھائی جیسا برتاؤ کرتی تھی۔ ایک دن تینوں لکھنؤ کا میوزیم دیکھنے کار سے گئے کسی ہوٹل میں رات کو ٹھہرے مجھے اس وقت ہوٹل کا نام یاد نہیں آ رہا ہے۔ ایک حسین عورت مینو لے کر سامنے آئی "یہ سب آپ کے ساتھ ہیں" اس نے کھانے کی فہرست (مینو) مسٹر بلائد کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ انگریز کے ساتھ دو ہندوستانی جوان لڑکے اور لڑکی کو دیکھ کر وہ کچھ چونکی پرشوتم کو دیکھ کر تو وہ اور بھی حیرانی سے چونکی "ایک شکل کے بہت سے لوگ ہوتے ہیں۔" پل بھر کو اس کے دماغ میں آیا مگر دل نہ مانا اور پوچھ ہی بیٹھی "تمہارا نام پرشوتم ہے؟"

"ہاں۔ مگر تم کیسے جانتی ہو میں نے تو تم کو کبھی دیکھا نہیں" پرشوتم تعجب کے ساتھ اس کی طرف دیکھتا رہا۔

"تم نے مجھے دیکھا ہے مگر تم بھول گئے ہو" پرشوتم کے پاس سرکتے ہوئے یہ تیس سالہ حسینہ بولی۔ پرشوتم نے اس کے گداز جسم کو نیچے سے اوپر تک بہ غور دیکھا ہر انگ سے جوانی ٹپک رہی تھی عمر کا صحیح اندازہ ہی نہیں ہو پا رہا تھا۔

"کہاں دیکھا ہے؟" متعجب پرشوتم کے منہ سے نکلا۔

میں بال مکند مالی کی لڑکی ہوں جو گاندھی سارک دلی میں کام کرتا ہے میرا نام چندا ہے جب میں کنواری تھی تو بھگوان نے ایک لڑکی دیدی میں اس کو سیکری میونسپل کمیٹی کے دفتر کے سامنے سیڑھیوں پر ڈال آئی تھی۔ اس پاپ کو چھپانے کی میں نے کافی کوشش کی مگر چھپ نہ سکا اور میں سب میں بدنام ہو گئی۔ سب کی نظر سے گر گئی میرا بھائی مجھ پر مٹی کا تیل چھڑک کر جلا ڈالنے کی ترکیب سوچ رہا تھا۔ جس رات میں یہ ہونے والا تھا میں ایک دن پیشتر ہی دن نکلنے سے پہلے گھر سے نکل بھاگی۔ ایک نوجوان کار سے بلند دروازہ دیکھ کر کہیں جا رہا تھا میں اس کی کار کے آگے آ گئی کافی ہارن بجائے مگر میں ٹس سے مس نہ ہوئی میں نے بھی سوچ لیا تھا کہ یا تو مٹ گئی یا بچ گئی۔ کار رک گئی۔

"کیا زندگی سے بیزار ہو"۔ نوجوان نے منہ باہر نکال کر کہا۔

"جی ہاں" میں نے پھرتی سے کہا۔

"کیوں" وہ اسٹیرنگ پر گال ٹیک کر پھر بولا۔

میرا کوئی نہیں ہے سارا خاندان مر گیا ہے۔ میری جوانی میری دشمن بن رہی ہے۔ میرا روپ میرا جان لیوا بن رہا ہے۔ جدھر جاتی ہوں لوگ بھوکے بھیڑیوں کی طرح ٹوٹ پڑتے ہیں اسی لئے مرجانا چاہتی ہوں مجھے کوئی سینے سے نہیں لگائے گا اس لئے مرجانا ہی ٹھیک ہے بابو جی" میں نے یوں بات بنائی لکھنؤ جانے والا نوجوان مجھ پر ترس کھا گیا اور کار کا دروازہ کھول دیا۔ میں اس کے پاس ہی اگلی سیٹ پر اس سے چپٹ کر بیٹھی میٹھی میٹھی باتیں کرتی رہی۔ لکھنؤ آ گیا میں بہت خوش تھی کہ اب زندگی بن گئی مگر جس ہوٹل میں آپ بیٹھے ہیں اسی ہوٹل میں وہ میرے ساتھ پوری رات رہا۔ دن نکلنے پر وہ ضروریات سے فارغ ہونے کے بہانے سے ایسا گیا کہ آج تک منہ دکھینے کو نہیں ملا میں اس کا انتظار ہی کرتی رہی آٹھ بجے کے قریب ایک آدمی آیا اور بولا "حسینہ تم اسی ہوٹل میں عمر بھر رہو گی کوئی تکلیف نہیں ہو گی کوئی پریشانی نہیں ہو گی ہمارے مالک

نے تم کو اس لڑکے سے دو ہزار روپے میں خرید لیا ہے تم کو کیا کام کرنا ہے آؤ میرے ساتھ مالک سے پوچھ لو۔" یوں کہہ کر وہ مجھے ساتھ لے گیا میں نے کوئی مخالفت نہیں کی کیونکہ میں جانتی تھی کہ یہاں سے بھاگ نکلنے کی کوشش بیکار ثابت ہوگی اور کار آمد بھی ہو گئی تو میرا کہیں ٹھیک ٹھکانہ بھی تو نہیں تھا کہاں جاتی اس لئے حالات سے سمجھوتا کر کے سر جھکا لیا اور جس طرح نصیب نے زندہ رکھا رہی ہوں۔

"کیا تم اپنے آپ کو یہاں خوش سمجھ رہی ہو۔" مسٹر بلائڈ نے پوچھا۔

"کیا بتاؤں مجبوری سب کچھ کرا لیتی ہے" یوں کہتے ہوئے چندا کچھ دیر کو چپ ہو گئی اور چندر کانت کے چہرے کو بغور دیکھنے لگی تھوڑی پر کالا تل اور گردن پر سرخ تل دیکھ کر اس کے دل میں شک نے جنم لیا اور آگے جھکی اور چندر کانت کا دایاں ہاتھ کھینچ کر دیکھتے ہوئے بولی "کیا تمہارے اس ہاتھ میں چھ انگلیاں تھیں؟"

"ہاں تھیں مگر انکل نے دہلی لا کر ایک کٹوا دی لیکن تم کو اس کا پتہ کیسے ہوا کہ میرے اس ہاتھ کی چھ انگلیاں تھیں۔"

"تم کو یہ میونسپلٹی کے دفتر کی سیڑھیوں پر ملی تھی" چندا نے پرشوتم سے پوچھا

"جی ہاں" پرشوتم نے سچ کا اقرار کیا۔

"میری بیٹی" کہتے ہوئے چندا چندر کانت کی طرف لپکی "میں تیری ماں ہوں مگر میں نے ماں ہونے کا کوئی بھی فرض تیرے ساتھ پورا نہیں کیا۔ میں کتنی بدنصیب ہوں سماج کا ڈر بھی کیسا برا ہوتا ہے کہ انسان کو انسان سے دل کے ساتھ بھی جینے نہیں دیتا،، کہتے کہتے چندا رونے لگی۔ "تم گنپت کے لڑکے ہو؟ آنسوؤں کو پونچھتے ہوئے اس نے پرشوتم سے سوال کیا۔

"جی ہاں"

"میری گڈ۔ چندا دیری گڈ۔ ایک بات بتاؤ تم میرے ساتھ چلنا چاہتی ہو تو میں تم کو یہاں سے آزاد کرانے کے لئے مینیجر سے بات کروں ہم تم سب ایک ساتھ رہیں گے۔ دہلی میں

میرا جُوتوں کا کارخانہ ہے۔ اپنی کوٹھی ہے ہمارے وہاں پہنچنے سے ہم تینوں کی خوشیاں اور بڑھ جائیں گی،، کہتے کہتے مسٹر بلائنڈ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اپنی طرف کھینچتے ہوئے سینے سے چمٹا لیا۔ چندر کا اور پرشوتم دوسری طرف دیوار سے ٹنگی لینن اور سُبھاش کی تصویریں دیکھتے رہے۔

••

"تعارُف"

نام	اُودے سرن شرما
تخلص	ارمان
سکونت	قصبہ بلاری ضلع مُرادآباد
تصنیفاتِ مطبوعہ	رازِ دنیاز (منظوم)
	سازِ آواز (منظوم)
	ارمانِ دل (قطعات)
	آئینے (قطعات)
	مُسلمان کا مندر (ناول)
	آشیرباد (ناول)
تصنیفاتِ غیر مطبوعہ ناول	کنواری ماں۔ ڈکیت اشارہ۔
	شریف زادہ۔ حق پرستی۔ زمانہ۔
	انجام۔ شکار۔ جلتا دیس بستی دھرتی۔
	ابھاگا۔ بیگانہ۔ تلوار۔
افسانے	پارس منی۔ سنگم۔
ہندی کا دیہ	کرمیتی۔ شری مہابھارت چھترپتی شواجی۔
بچوں کے لئے	ٹھوکریں (منظوم)
انتخابِ اشعار	شہ پارے
مشاغل	طب اور کاشتکار
تعلیم	بی۔ اے تک

شریف رزیل

"ساہو صاحب آپ کو داروغہ جی نے یاد کیا ہے" سپاہی نے کہا

"اسی وقت؟" شراب کا پیالہ ایک طرف رکھتے ہوئے ساہو صاحب نے سپاہی سے پوچھا

"جی ہاں اسی وقت۔ گستاخی معاف ہو۔"

"اچھا چلتا ہوں۔ خیریت تو ہے؟"

"خیریت کیوں نہیں ہوگی صاحب" سپاہی نے قمیض کا کالر ٹھیک کرتے ہوئے جواب دیا۔ ساہو صاحب اُٹھے اور سپاہی کو ساتھ لے کر کار سے روانہ ہوئے۔ داروغہ جی تھانے میں ان کا انتظار کر ہی رہے تھے۔ دیکھتے ہی ان کا سواگت کیا اور کھڑے ہوگئے۔ ہاتھ ملایا اور کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ "بے وقت تکلیف دینے کی معافی چاہتا ہوں ساہو صاحب" داروغہ جی نے نرمی سے کہا

"نہیں نہیں صاحب ایسی بھی کیا بات ہے جب کام آپڑے تو وقت بے وقت حکم فرمایئے کیا خدمت ہے بندے کے لائق۔"

"یہ چار ڈکیت آپ کے چونہ پکانے کے بھٹے پر کہیں ڈکیتی ڈالنے کا پروگرام بناتے ہوئے پکڑے گئے ہیں۔ کچھ بھاگ بھی گئے۔ مَیں نے سُنا ہے کہ ایسا کئی بار ہوا ہے کیونکہ وہاں جنگل ہے کیا آپ کو اس کا پتہ نہیں۔"

"آپ نے سُنا ہوگا مگر مَیں نے کبھی نہیں سُنا۔۔ بھٹے پر رہنے والے میرے نوکر

نے بھی کبھی اس قسم کی بات مجھ سے نہیں کہی۔ کیا یہ ڈکیت ہیں۔" چاروں گرفتار لوگوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔

"جی ہاں چاروں ڈکیت ہیں ایک طمنچہ ان کے پاس سے برآمد ہوا ہے ان کے جو ساتھی بھاگ گئے ان کے پاس اور بھی خطرناک ہتھیار ہو سکتے ہیں۔" جنرل نیازی کی طرح تکبرانہ انداز میں بولے۔ ساہو صاحب سردی کے باعث اپنے اوورکوٹ کا کالر سنبھالتے رہے اور کچھ سوچتے رہے ایک نظر ان چاروں پر پھر ڈالی۔ سب نیم عریاں کمزور لاغر سکڑے سکڑے ایک طرف بیٹھے تھے۔ انداز بھکاریوں جیسا تھا مگر یہ سب پولیس کی نظر میں ڈکیت تھے۔ ساہو صاحب لمحہ بھر کے بعد ان سے بولے "کیوں بھئی تم لوگوں کو داروغہ جی نے میرے بھٹے پر سے پکڑا ہے؟"

"ہاں سرکار یہ سچ ہے۔"

"اور یہ طمنچہ بھی تمہارا ہی ہے؟"

"جی"

"اور تمہارے کچھ ساتھی بھی تھے جو بھاگ گئے ہیں۔"

"جی" کانپتے ہوئے ایک نے کہا

"ٹھیک ہے داروغہ جی جب مجرم خود اقرار کر رہے ہیں تو اس سے بڑا اس کے مجرم ہونے کا اور ثبوت کیا ہو سکتا ہے جو بھی مناسب کارروائی سمجھو کرو میں چلا" ساہو صاحب یہاں سے سیدھے گھر کو جانے کے ارادے سے اٹھے لیکن راستے میں خیال بدل گیا اور بھٹے پر جا پہنچے۔

"پنڈت جی" زور سے آواز لگائی۔ بھٹے پر سے پنڈت جی نے مالک کی آواز پہچان کر فوراً کہا۔

"آیا سرکار" پاس آکر نمسکار کی اور پھر بولے "اتنی رات گئے کیسے کشٹ کیا سرکار خیریت تو ہے۔"

"کیا داروغہ جی یہاں سے چار ڈکیت پکڑ کر لے گئے ہیں؟"

"جی ہاں چار آدمیوں کو پکڑ کر تو ضرور لے گئے ہیں لیکن وہ ڈکیت نہیں بھکاری ہیں۔ بہت دنوں سے رات کو یہاں آکر سو جاتے ہیں دن بھر بھیک مانگتے ہیں۔"

"بھکاریوں کے پاس طمنچے کا کیا کام۔"

"سرکار طمنچے کی بات کر رہے ہیں۔ جب میرے سامنے پکڑے گئے تھے تو اُن کے پاس سے لوہے کی کیل بھی برآمد نہیں ہوئی تھی تھپ تھپا کے کسٹم ادھیکاری کی طرح سارا جسم دیکھ لیا تھا۔ داروغہ جی نے ایک لنگڑے بھکاری کے پاس سے ضرور ایک امرود کی لکڑی برآمد کی تھی۔ وہ تو سچ مچ بھکاری ہیں۔ پولیس والے تو ان کے پاس رائفل بھی دکھا سکتے ہیں۔ کیس بنانا تو ان لوگوں کو خوب آتا ہے۔"

"وہ بھکاری ہی ہیں اس کا تمھارے پاس کیا ثبوت ہے۔"

"سرکار ایک بار میں نے چھپ کر ان کی بات چیت سُنی تھی وہ کہہ رہے تھے کہ ایک طرف وہ لوگ ہیں جو کے پالتو جانور تک لحافوں میں سوتے ہیں ایک طرف ہم لوگ ہیں کہ انسان ہو کر بھی نہ تن کو ہے نہ پیٹ کو ہے۔ ایک نے کہا بھائی یہ تو سب نصیب کی بات ہے۔ بھگوان نے یہی لکھا ہے کہ در در کی ٹھوکر کھائیں، بھیک مانگیں اور روتے روتے مر جائیں۔ تیسرا بولا بھیک مانگنے والوں کی تو سرکار بھی مخالف ہے۔ ایک جگہ اسٹیشن پر لکھا تھا کہ بھیک مانگنے والے کو بھیک دینے کی ہمت نہ بڑھائیے۔ مگر سرکار نے بھیک مانگنے والوں کے لئے کوئی کام نہ دیا جس سے وہ بھیک مانگنے کا کام چھوڑ دیں۔ چوتھا بولا ارے گدھے اس سرکار کے پاس اچھے خاصوں کے لئے تو کام ہے نہیں تمھیں کہاں سے کام دے دے گی۔ تم سے کوتار ہی روٹھ گیا ہے سرکار کی کیا آس کرتے ہو۔ میں نے اتنی باتیں سنیں اور چلا گیا اپنا سا منہ لے کر کچھ بھید ہاتھ نہ لگا۔ میں بھی سوچ رہا تھا کہ یہ لوگ خطرناک نہ ہوں لیکن اس دن سے میں نے ان پر شک کرنا چھوڑ دیا۔ بیچارے اس بھٹہ کی آگ سے تاپ تاپ کر رات کاٹ دیتے ہیں آلو اور شکر قندی بھون بھون کر کھاتے رہتے ہیں مجھے تو یہ دیکھ کر ترس آتا تھا

اور میں انھیں خوشی سے یہاں رہنے دیتا تھا۔"

"ٹھیک ہے" ساہو صاحب نے یہ باتیں سُن کر کچھ فیصلہ کیا۔ انھوں نے اِدھر اُدھر دیکھا کسی چیز کے جلنے کی بُو محسوس ہو رہی تھی وہ بھٹے کی طرف بڑھے اور بھوسل کو بید سے کریدنے لگے اس میں دبے سنگھاڑے اور آلو اب جل کر قریب قریب کوئلہ ہو چکے تھے پنڈت جی سنجیدگی سے بولے "آج تو بیچارے بھوکے ہی رہ گئے"

"پنڈت جی تم ٹھیک کہتے ہو یہ لوگ بھکاری ہیں پولیس والے اپنی کارکردگی دکھانے کے لئے شرفیوں کو رزیل بنا رہے ہیں۔ چلو ذرا میرے ساتھ چلو" پنڈت جی اور ساہو صاحب دونوں کار میں بیٹھ کر پھر تھانے میں پہنچے۔ "داروغہ جی اگر آپ کو کچھ اعتراض نہ ہو تو میں ایک بار ملزمان سے ملنا چاہتا ہوں" ساہو صاحب نے جھومتے ہوئے اجازت مانگی۔

"آپ خوشی سے مل سکتے ہیں ساہو صاحب" داروغہ جی نے اجازت دیدی اور ان کے پیچھے پیچھے آنکھ کے اشارے سے ایک سپاہی بھی بھیج دیا تاکہ ان کی باتوں کو سُن سکے۔

"کیوں بھئی تم میں سے طمنچہ کس کے پاس تھا۔"

چاروں نے ایک دوسرے کا منہ دیکھا۔ پھر ایک نے کہا "جی طمنچہ میرے پاس تھا۔"

"دیکھو بھکاری بھی بھگوان کو مانتے ہیں۔ ان کا بھی ایمان ہوتا ہے سچ سچ بتانا۔ جھوٹ بولنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"سچ سچ بتا رہا ہوں سرکار" پھٹے دامن کو ننگی ٹانگوں پر سرکاتے ہوئے بھکاری بولا۔

"اگر سچ سچ بول رہے ہو تو فوراً جواب کیوں نہیں دیا۔ ایک دوسرے کی طرف کیوں دیکھتے رہے۔"

"سرکار سچ بولنے پر جان جاتی ہے اس لئے سچ بولنے سے پہلے ہمت سے کام

لینا پڑتا ہے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ تم بھکاری کے روپ میں بدمعاش ہو۔"

"اب اس میں شک کی گنجائش ہی کیا رہ گئی سرکار۔"

یہ سُن کر پنڈت جی بولے "تم لوگ جھوٹ بولتے ہو جب میرے سامنے پولس نے تمھاری تلاشی لی تھی تو تمھارے پاس کچھ بھی نہیں تھا پھر طمنچہ کہاں سے آگیا تمھارے پاس کھاؤ قسم گیتا اور رامائن کی کہ یہ طمنچہ تمھارا ہے۔ ہندو دھرم کو مانتے ہو اٹھاؤ کاشی کی طرف ہاتھ۔" یہ سنتے ہی چاروں سہم گئے اور گمبھیر بادلوں کی طرح زمین کو گھورنے لگے "بولتے کیوں نہیں" ساہو صاحب نے کڑک کر کہا۔

"ساہو صاحب غریب دھرم کو مانتا ہے اور بھگوان کو بھی مانتا ہے سچ مچ ہم جھوٹ بول رہے ہیں ہمیں بدمعاش ثابت کرنے کے لئے پولیس نے طمنچہ ہم سے برآمد ہوا دکھایا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ پولیس نے یہ طمنچہ اپنے پاس سے رکھا ہے کچھ بیان ہمیں سکھائے ہیں کہ یوں کہنا ہے۔ ہم نے ان بیانوں کو خوشی سے مان لیا اور طمنچہ بھی خوشی سے اپنا لیا۔ اس جھوٹ کو خوشی سے اپنانے میں ہی ہمارا بھلا ہے۔

"کیا"

"شریف سے رزیل بن کر کھانا بھی ملا مکان بھی ملا کپڑے بھی اوڑھنے بچھانے کو ملے جب تک شریف بھکاری بنے رہے ہر طرح دُکھی رہے حوالات میں آکر بڑے سُکھی ہیں اور یہ دُعا کرتے ہیں کہ جیل سے ساری زندگی رہا نہ ہوں۔ یہاں کچھ کام تو ملے گا کھانا کپڑا تو ملے گا۔ زندگی کی سب ضروری چیزیں یہاں ملیں گی تو باہر جا کر کیا کریں گے۔ آپ ہمیں چھڑانے کی کوشش میں پریشان ہیں لیکن یہ کوشش ہمارے حق میں بُری ثابت ہوگی۔ داروغہ جی کا ظلم بھلا ثابت ہوگا۔ ہم شریف سے رزیل اچھے ہیں۔ ساہو صاحب اور پنڈت جی کھڑے کھڑے نہ جانے کیا سوچ رہے تھے۔

جذبۂ انتقام

چاروں طرف گھنگھور گھٹاؤں کے چھا جانے سے سورج وقت سے پہلے ہی غروب ہوا معلوم ہوتا تھا کبھی کبھار بادلوں سے بیوہ کے آنسوؤں کی طرح کوئی کوئی بوند ٹپک جاتی تھی۔ نیک سنگھ کی بہو نے دروازہ بند کر لیا تھا اور کھانا بنانے رسوئی میں چلی گئی تھی۔ نیک سنگھ اپنے کمرے میں بیٹھا دکان کا حساب کتاب کر رہا تھا۔

گوکل فلش سے باہر نکلا اور نیک سنگھ کے کمرے کی کنڈی باہر سے لگا دی۔ بیچارہ نیک سنگھ چیختا چلاتا رہا "ارے بھئی میں اندر ہوں۔ دکان کا حساب کتاب کر رہا ہوں۔ مذاق کیوں کرتے ہو۔ کواڑیں تو کھولو۔ کشوری دیکھنا یہ کون شخص ہے جس نے کواڑیں بند کر دیں۔"

"ابھی آئی" کشوری نے دھوئیں سے لال آنکھیں ملتے ہوئے کہا جوں ہی وہ صحن میں آئی اس نے گوکل کے ہاتھوں میں چمچاتا ہوا لمبا کھلا چاقو دیکھا۔ وہ ٹھٹھک گئی۔

"ذرا بھی لب ہلائے تو مولی کی طرح گلا کاٹ دوں گا۔" دانت چباتے ہوئے گوکل نے کہا۔

"چاقو کا خوف مجھے بولنے سے بند نہیں کر سکتا۔ گوکل تو نے یہاں بھی میرا پیچھا نہ چھوڑا۔ آخر تو چاہتا کیا ہے" مٹھیوں کو بھینچتے ہوئے کشوری گرجی۔ یہ باتیں کمرے میں بند نیک سنگھ بھی سن رہا تھا۔ گوکل اپنی مضبوط بانہوں میں زبردستی

کشوری کو جکڑتے ہوئے کمرے میں لے گیا اور پلنگ پر پٹک دیا "تم دونوں میری مٹھی میں بند چڑیا کی طرح قید ہو ذرا بھی حرکت کی تو دونوں کا کام تمام کر کے چلا جاؤں گا۔" اس طرح کہہ کر اس نے کشوری کو بھی کمرے میں بند کر دیا اور پھر وہ نیک سنگھ کے کمرے کے دروازے پر پہنچا نیک سنگھ چپ چاپ کمرے میں پڑے رہو اگر شور مچایا تو دونوں کی خیر نہیں ہے۔ شور مچانے سے ہونا کچھ نہیں ہے۔ اس وقت کوئی گھر سے باہر نہیں نکلے گا بجلی چمک رہی ہے بادل کڑک رہے ہیں ہوا سنسنا رہی ہے۔" گوکل کے یہ الفاظ نیک سنگھ کے کانوں میں زہریلے تیروں کی طرح گھستے چلے گئے۔ اس نے حالات کی نزاکت کا اندازہ لگا لیا تھا۔ وہ کمرے کے اندر ادھر سے اُدھر ہتھیلیاں مسلتا ہوا چکر کاٹ رہا تھا۔ طرح طرح کے خیال اس کے دل و دماغ کو پریشان کئے ہوئے تھے۔ گوکل لوٹ کر کشوری کے کمرے کے دروازے پر آ گیا۔ کواڑ کھولا اندر داخل ہوا ایک نظر کمرے کا جائزہ لیا اور پھر کشوری کے دہکتے ہوئے بدن پر ایک نظر غلط انداز سے ڈالتے ہوئے کہنے لگا "بڑا تڑپایا ہے تم نے آج تو پیاس بجھا کر ہی جاؤں گا۔ میکے میں نہیں سسرال میں تو قابو میں آ گئی اب کہاں جاؤ گی مجھ سے بچ کر۔" گوکل فاتحانہ انداز میں بولا۔

گوکل تو اتنا نیچ بن جائے گا مجھے اُمید نہ تھی تو تو مائکے میں مجھے بہن کہا کرتا تھا اور یہاں تو یہ رُوپ دھار کر آیا ہے۔ تو میری عزت سے کھیلنا چاہتا ہے کمینے۔ اب تو میرا جس کے ساتھ بیاہ ہو گیا اسی کی ہوں تیری تو بہن ہی ہوں ابھی کچھ نہیں بگڑا ہے ورنہ راون کی سی گت ہو گی۔ چلا جا یہاں سے" کشوری نے ہمت سے کہا۔

"کشوری یہ نصیحت مجھ پر بے اثر ہے میں ایسی باتوں کا قائل نہیں ہوں یہ تو دُنیا کو دکھانے کے لئے کہے جانے والے رشتے ہیں۔ دل سے اِن کا دُور کا بھی تعلق نہیں ہوتا ہے۔ وقت کی قدر کر و یہ ہوا یہ فضا یہ گھٹا اور یہ ادا" کہتے کہتے گوکل نے کشوری کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے۔

"گوکل دیکھ تیرے بھی دو ہاتھ ہیں اور میرے بھی۔ تو چاقو سے میری جان لے سکتا ہے۔ میں جانتی ہوں مگر تجھے بھی معلوم ہونا چاہیئے کہ میں بھی تیری جان لینے کے لئے ایک گھاتک ہتھیار رکھتی ہوں۔ تیری تو کیا تیرے خاندان تک کی جان لے سکتی ہوں" ہاتھوں کو چھڑانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کشوری بولی۔ دوسرے کمرے میں بند نیک سنگھ کو بھی بھنک پڑ رہی تھی مگر وہ بے بس تھا۔ کسمسا کسمسا کر رہ جاتا تھا۔

"وہ کون سا ہتھیار ہے ذرا میں بھی تو دیکھوں" گوکل ہاتھ چھوڑتے ہوئے بولا۔

"بددعا" ہانپتے ہوئے بولی۔

"ارے واہ۔ مان گئے تمہارے ہتھیار کو ہارے ہوؤں کا یہی ہتھیار ہوتا ہے کشوری" یوں کہتے ہوئے اس نے پھر اس کو باہوں میں بھینچ لیا اور رخساروں کا بوسہ لینے کو ہونٹ بڑھائے کشوری نے اپنا منہ اس سے بچا لیا۔ اور کئی بار اسی طرح اس کی کوشش بے کار گئی وہ بوسہ نہ لے سکا۔ ایک بار اس نے پھر ہاتھ چھوڑ دیئے اور پلنگ پر بیٹھ گیا۔ "کشوری میں تم کو خود راضی ہو جانے کے خیال سے آزاد کر کے شکست مان کر بیٹھ گیا ہوں ورنہ جانتی ہو تم اپنے پھول سے گال خود میرے ہونٹوں پر رکھ دو گی عورت آدمی کے مقابلے کی طاقت ہی کہاں رکھتی ہے۔" اس طرح کہہ کر گوکل نے چاقو چمکایا۔

گوکل تو اس چاقو سے مجھ کو جیت نہیں سکتا۔ مجھے جیتنے کے لئے تم میں ہمت ہی نہیں ہے۔" ہونٹ بچا کر کشوری نے کہا۔ نیک سنگھ کے کانوں میں کشوری کے لئے خود داری میں سرشار یہ الفاظ پہنچے تو اسے کشوری پر فخر ہوا۔ پل بھر کو نیک سنگھ کے بازو تنے مٹھیاں سخت ہوئیں مگر کواڑیں بند تھیں وہ وہیں سہم گیا اور دروازے کی دراڑوں سے باتیں سنتا رہا۔

"تجھے جیتنے کا کون سا حربہ میرے پاس نہیں؟ اپنے آپ دم خم پر اکڑتے ہوئے

گوکل نے کہا

"پیار"

"پیار؟ ارے یہ تو چھوٹی سی بات ہے عورت مرد کے جسم میں طاقت اور اس کی جیب میں دولت چاہتی ہے۔ یہی دونوں اس کو ہراتے ہیں۔"

"گوکل یہ عورت کی نہیں رنڈی کی خصلت ہے طوائف کے اوصاف ہیں۔ اگر یہ ہتھیار میرے پاس ہوتا تو میری شادی تیرے ہی ساتھ ہوتی لیکن تو نے میرے ساتھ شادی کرنے کے لئے میرے پتاجی پر غنڈوں کا اثر ڈلوایا جس سے تیرا بنا بنایا کام بگڑ گیا۔ اگر تو پیار سے میرے پتا کو متاثر کرتا تو وہ میری شادی تیرے ساتھ کرنے میں ذرا بھی سنکوچ نہ کرتے۔" کشوری کی سانس پھول رہی تھی ماتھے پر پسینہ جھلک رہا تھا دوسرے کمرہ میں نیک سنگھ کو بھی یہ بھنک پڑ رہی تھی اور وہ حقیقت کا پورا پورا جائزہ لے چکا تھا اب وہ سب کچھ جان گیا تھا کہ یہ سب کچھ کیا ہے اور کیوں ہے۔

"اچھا کشوری تم نے مجھے کتا تو کہا ہے میں بھی تم کو کتیا بنا کر ہی چھوڑوں گا" کہتے ہوئے اس نے چاقو کی نوک پلنگ کے پائے میں گاڑ دی اور دونوں ہاتھ اس کے ناہموار گداز سینے کی طرف بڑھائے اور نیچے کو جھکا کر کشوری نے اس کے دونوں کان سختی سے پکڑ لئے "اچھا یہ بات ہے مگر ان سے قیمتی چیز میرے ہاتھوں میں ہے۔"

"تیرے ہاتھ مٹی کی کایا پر ٹکے ہیں اور میرے ہاتھوں میں تیری ابرو ہے نیچ۔" پل بھر کو کشوری ڈھیلی ہو گئی اس نے کچھ سوچا گوکل حالات اپنے موافق ہوتے سمجھ کر اس کے سینے سے الگ ہو گیا اور جھٹکا مار کر کان چھڑا لئے "کشوری زبان کی بہت تیز ہو" پیڑو کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے اس نے کہا۔ کشوری نے ساری طاقت بٹور کر دونوں ٹانگیں سمیٹیں۔ گوکل کو اس انداز میں کوئی خوشی کا پہلو ابھرتا نظر آیا اور وہ اپنے حساب سے سوچتا رہا مگر کشوری نے دونوں لاتیں کس کر اس کے نازک حصوں پر دے ماریں اور وہ غلیل کے غلے کی طرح نیچے جا گرا۔ کشوری نے پائے میں گڑا چاقو نکالنے

کی کوشش کی مگر وہ اس کوشش میں ناکام رہی اتنی ہی دیر میں ظالم نیچے سے اُٹھ کر پھر پلنگ پر چڑھ گیا اور کشوری کے ہاتھ سے چاقو لے کر بولا۔ "تم بھی جیت کے لئے اس ہتھیار کا سہارا لینے لگیں۔ یہ تو ہماری جیت کا ذریعہ ہے تمھاری جیت کا ہتھیار تو بددعا ہے کرو بددعا کا استعمال پیاری" کہتے کہتے اس نے ساڑھی کھینچنا شروع کر دی۔ کشوری ساڑھی پکڑے ہوئے تھی مگر اس کا دم پھول رہا تھا اور اپنی کوشش میں ناکام ہوتی چلی جا رہی تھی۔ اس کے بال پورے چہرے پر بکھرے ہوئے تھے "مرد کے فولادی ہاتھوں کا مقابلہ عورت کے نازک ہاتھ کبھی نہیں کر سکتے" فخر کے ساتھ جسم سے ساڑی الگ کر کے زمین پر پھینکتے ہوئے اس نے پھر کہا "ابھی کیا ہے یہ پیٹی کوٹ یہ بلاؤز سبھی کچھ جسم سے الگ کر دوں گا۔ میں عورت کے جسم کی قدرتی خوبصورتی دیکھنا چاہتا ہوں روپ کے بیچ میں کپڑوں کی دیوار مجھے گوارہ نہیں ہے۔ بہت دنوں سے تڑپ رہا ہوں تجھ ایسی آج کی دروپدی کے لئے کرشن آ کر تیری مدد کرنے سے رہے آج تو جو میں چاہوں گا وہی ہوگا کشوری" گوکل نے متکبرانہ انداز میں کہا۔

"وہ سب کی مدد کرتا ہے کمینے میری بھی مدد کرے گا وہ ہر جگہ ہے"۔ "اچھا دیکھ لیں گے تیرے مہاراج کو بھی" اور جوش میں آ کر گوکل نے پیٹی کوٹ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ کشوری کی آنکھوں میں خون اُتر رہا تھا وہ دُرگا بنی ہوئی تھی اور ناگن کی طرح پھنپھنا رہی تھی مُٹھیاں بھینچ رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ اگلا قدم کیا اٹھایا جائے اپنی جان کا موہ چھوڑ کر اس نے ایک بار گوکل کا تمتماتا ہوا چہرہ دیکھا وہ ابھی کمر بند کی گانٹھ بھی نہ کھول پایا تھا کہ اس نے گھونسوں کے وار کرنے شروع کر دیئے ایک چوڑی تو ٹوٹ کر اس کے گال میں گھس گئی اور آر پار ہو گئی۔ اس نے کمر بند چھوڑ دیا اور چوڑی نکالنے میں لگ گیا۔ کشوری کو اپنا انجام دکھائی دے رہا تھا۔ اس لئے اس نے لاتوں اور گھونسوں کے وار کم نہیں کئے۔ گوکل کی آبرو پر حرف آنے لگا تھا اس کے ضمیر نے اس کے خیالات کو نیا موڑ دیا۔ وہ دانت کٹکٹا کے اس کے گالوں پر جھکا کشوری نے بری طرح اُس کے مُنہ پر تھوک دیا۔ وہ گھگیا کے پونچھنے لگا جذبۂ انتقام زور پکڑنے لگا اور طیش میں آ کر

فہرست

عنوان	صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر
تعارف	۳	معصوم دشمن	۱۱۴
اظہارِ تشکر	۵	سیڑھی	۱۲۲
نذرِ خلوص	۶	چنتر دواہ	۱۳۰
تقریظ	۷	پاس ہوگئے	۱۴۱
[illegible]	۹	بھولا بھٹکا	۱۴۷

اُس نے اپنا چاقو اس کے پیٹ میں گھسیڑ دیا۔ پھٹی ہوئی کھال سے آنتیں دھیرے دھیرے بل سے باہر نکل رہے سانپ کی طرح سرکنے لگیں۔

"کیوں کتے تیرا چاقو تیری ہار کا کارن بنا کہ نہیں، جیت میری ہوئی دیکھ کر" کشوری نے۔" کہتے کہتے کشوری نڈھال ہو گئی۔ گوکل کو ایسا محسوس ہوا جیسے کشوری دوسری بار اس کے منہ پر تھوک رہی ہے اس نے چاقو پر نفرت کی نظر ڈالی اور فرش پر پٹک دیا جیسے اس نے کشوری کے آخری الفاظ کو منظور کیا ہو۔ چاقو کے فرش پر پٹکنے کی آواز سے نیک سنگھ چونکا اس سے پہلے اسے کوئی آواز صاف صاف سنائی نہ دی تھی۔ کواڑیں کھلنے کی آواز اس کے کانوں میں پڑی پھر صدر کی کواڑیں کھلیں۔ اس طرح نیک سنگھ کو یہ محسوس ہو گیا تھا کہ گوکل باہر چلا گیا ہے "کشوری او کشوری" نیک سنگھ نے چیخ کر پکارا مگر کوئی آواز نہیں آئی "کشوری معلوم ہوتا ہے کہ تو بہادری کے ساتھ ظالم سے آن بچانے میں تو کامیاب ہو گئی مگر مجھے تنہا چھوڑ کر چلی گئی ہے۔" وہ بُدبُداتا رہا۔ اتنے میں ٹومی پالتو کُتا داخل ہوا جو شام کو کواڑیں بند ہوتے وقت دھوکے سے باہر ہی رہ گیا تھا گھڑی بھر میں اس نے سارے کمرے کا چکر لگایا۔ کُتے کے بھونکنے کی آواز سُن کر نیک سنگھ نے کہا "نمک حرام اب آیا ہے وقت پر تو نے بھی پیٹھ دکھا دی جس مالکن نے تجھے بیٹے کی طرح پالا اس کے دُکھ میں پل بھر کو بھی شریک نہ ہو سکا۔" یہ سُن کر کُتا باہر کھڑا کھڑا پنجوں سے کواڑوں کو کھرچتا رہا جیسے کہ وہ اپنی مجبوری اور ہمدردی کی صفائی پیش کر رہا ہو اور کہہ رہا ہو کہ تم نے معمول کے مطابق اس کو آواز دے کر اندر بلا کر کواڑیں بند کیوں نہیں کی تھیں۔

دن نکلے میٹر ریڈنگ کرنے والا آیا تب نیک سنگھ کے کمرہ کی کواڑیں کھلیں سارا گھر سُنسان تھا ٹومی جو مالکن کی لاش کے پاس بیٹھا بیٹھا روتا رہا تھا نیک سنگھ کی ٹانگوں سے آکر چمٹ گیا "ہٹ یہاں سے" لات مارتے ہوئے کُتے سے بولے۔ وہ کچھ سہم گیا۔ نیک سنگھ اپنی پیاری کے پلنگ کے پاس گئے۔ کُتا بھی وہیں جا کر

بیٹھ گیا۔ اس نے مالکن کے خون کو زبان تک بھی نہیں لگائی تھی، خون فرش پر پھیلا پڑا تھا، آنتیں پھول گئی تھیں اور نیلی پڑ گئی تھیں۔ نیک سنگھ کو اس کے مرنے کا احساس تو ہو گیا تھا لیکن اس طرح شہید ہوئی ہے اس کا پتہ نہ تھا۔ اس درگت کو دیکھ کر اس کو بہت دکھ ہوا۔ وہ کشوری کے سر پر بڑے ضبط کے ساتھ ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا "میری پیاری تو نے اپنی آبرو نہ دی اور جان دیدی، تو آن کی حفاظت کے لئے شہید ہو گئی۔ تو نے زندگی کے اصل منشا کو حاصل کر لیا۔" یہ کہتے کہتے نیک سنگھ آٹھ آٹھ آنسو رونے لگا۔

کتا دم ہلا رہا تھا اس نے مالکن کے تلوے چاٹنا شروع کر دیئے۔ اشکوں سے لبریز آنکھوں سے نیک سنگھ نے کتے کو دیکھا اور غور سے دیکھتا رہا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کیسا عجیب جانور ہے خون کی ایک بوند تک زبان سے نہیں لگائی جب کہ یہ گوشت خور جانور ہے۔

اس نے کشوری کے جسم کو پھر ایک بار دیکھا اور کانپتے ہونٹوں کو دانتوں میں دبائے بڑے ضبط کے ساتھ کھڑا ہوا اور اس کے چہرے پر نظر جمائے ہوئے کہنے لگا "کشوری تیرے پیار کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں بھی اس خون کا بدلہ ضرور لوں گا۔"

پولیس میں رپورٹ ہوئی۔ تمام محلّے والے آ آ کر جمع ہو گئے۔ جو ہونا تھا ہوا۔ اس گھٹنا کے تین دن بعد نیک سنگھ کی بیقراری اور دماغ کی حالت غیر ہونے لگی، گھر کاٹ کھانے کو دوڑتا تھا، ہر چیز میں چھرے ہی چھرے نظر آتے تھے۔ دن تو گھوم پھر کر کاٹ ہی لیتا تھا رات مصیبت سے کٹتی تھی۔ رات بھر نیک سنگھ کبھی کشوری کی چوڑیاں اور گہنے گھنٹوں چومتا رہتا تھا۔ پہروں اس کی ساڑیوں میں منہ لپیٹے روتا رہتا تھا۔ جس پلنگ پر اس نے سہاگ رات منائی تھی اسی پر اس کا فوٹو رکھ کر زمین پر بیٹھ جاتا تھا۔ کیا کیا باتیں یاد آتی

تھیں اسے آنسوؤں سے بھری آنکھیں بھی کچھ یاد کر کے مُسکرا دیتی تھیں کبھی وہ اس کے چپلوں کو ہاتھوں میں پہن لیتا تھا۔ کئی بار تو اس نے کشوری کی چوٹیوں کو گلے میں لپیٹ کر خودکشی کرنے کی بھی سوچی تھی مگر کوئی غیبی طاقت اس کو یہ سمجھا کر روک دیتی تھی کہ کشوری نے تو آن کی خاطر جان دی۔ تُو کس لئے جان کھوتا ہے اور وہ رُک جاتا تھا۔ اس کو موت کا بدلہ لینا تھا خودکشی یہ مسئلہ حل تھوڑے ہی کر سکتی ہے۔

نیک سنگھ نیم پاگل سا ہو گیا تھا۔ اس واقعہ کی تکلیف کو اس کا دماغ برداشت نہیں کر سکا تھا۔ لوگ اس کے دماغ کی حالت کا اندازہ اسی وقت لگانے لگے تھے جب وہ شمشان میں جا جا کر گھنٹوں اس کی ہر دوار لے جانے کے لئے رکھی ہوئی ہڈیوں سے باتیں کرتا تھا اور چومتا رہتا تھا۔ بے جان چیزوں سے رام کی طرح باتیں کرنا اس کے پاگل پن ہی کا ثبوت تھا۔ جو بھی اس کی حالت دیکھتا دُکھی ہوتا تھا مگر کوئی بھی اس کے لئے کچھ نہیں کر سکتا۔

ایک رات گیارہ بجے چاقو لے کر نیک سنگھ سسرال جا پہنچا اور گوکل کا گھر معلوم کر کے دروازہ جا کھٹکھٹایا

"کون" اندر سے آواز آئی۔ آواز زنانی تھی شاید اس کی بہو بول رہی تھی۔ گوکل گھر نہیں تھا کہیں ڈکیتی کو گیا تھا۔

"کھولو تو سہی" دھیرے سے نیک سنگھ نے کہا۔ بہو بچے کو سُلا رہی تھی اٹھی اور سوچتی ہوئی دروازہ کی طرف بڑھی کہ گوکل کا کوئی سنگی ساتھی آیا ہوگا کسی خاص کام سے جیسا کہ پہلے سے ہوتا آیا ہے۔ اس نے کواڑیں کھولیں "کیا کام ہے؟" چہرہ پہچاننے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے پھر پوچھا "کہاں سے آنا ہوا؟"

"گوکل میرا دوست ہے وہیں سے آیا ہوں"

"گھر نہیں ہیں باہر گئے ہیں وہیں سے کہاں سے آئے ہو"

"اندر داخل تو ہونے دو پھر ساری باتیں سمجھا دوں گا۔"

"آیئے" وہ حیرت کے موڈ میں بولی۔

"آپ سے ملنے کی نیت سے" ہوش سنبھالتے ہوئے بولا

"مجھ سے ملنے کی نیت سے؟ اور ابھی ابھی تو گوکل سے ملنے کو کہہ رہے تھے؟"

"وہ تو بہانا تھا ملنا آپ ہی سے ہے۔"

"بھائی صاحب آدمی آدمی سے ملتا ہے عورت عورت سے ملتی ہے آپ کی دوستی گوکل سے ہے کملا سے نہیں۔"

تم ٹھیک کہتی ہو لیکن گوکل نے مجھے یہی سکھایا ہے کہ لوگوں کے گھروں میں گھس جاؤ اور ان کی عورتوں کی آبرو لے لو اور پھر ان کی جان بھی لے لو، بس ہو جاؤ تیار۔" چاقو کھول کر اور مضبوطی سے پکڑ کر چمچماتے ہوئے کہا۔ یہ دیکھتے ہی کملا کا کمل سا چہرہ مرجھا گیا۔ اس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ وہ کچھ سمجھ نہ پائی

"تم چاہتے کیا ہو میری جانچ لینے آئے ہو یا جان لینے؟"

فوراً ساڑی اتار دو۔ دیر کا موقع نہیں ہے۔ ذرا بھی آنا کانی کی تو اس بچے کو پیروں تلے کچل دوں گا اور یہ چاقو تمہارے گلے کے پار کر دوں گا۔ یوں سختی سے کہا کہ کملا سہم گئی ایک نظر بچے پر ڈالی اور ایک نظر ظالمانہ روپ دھارے نیک سنگھ پر اور ساڑی اتار کر رکھ دی اس کے علاوہ کوئی چارہ ہی نظر نہیں آتا تھا "بلاؤز بھی اتارو" اس نے تعمیل کی۔ انگیا نے اس کا پردہ رکھ لیا تھا۔ "پیٹی کوٹ اتارو" نیک سنگھ نے سختی سے کہا اور وہ اس بار کچھ ٹھٹھکی اور ہاتھ کمر بند پر آکر ٹھہر گئے انگلیاں کانپ رہی تھیں جیسے کہ کمر بند ایک ناگ تھا "اے کتیا رُک کیوں گئی، کیا سوچ رہی ہے تو یہ میں خود ہی کرتا ہوں" چاقو ہاتھ میں لئے نیک سنگھ اس کی طرف بڑھا یہ دیکھتے ہی اس کے ہاتھ ازار بند کھولنے

میں لگ گئے۔ ابھی ازار بند کی گانٹھ کھلی بھی نہیں تھی "ٹھہرو" اس کے منہ سے نکلا وہ سنہری امید لیئے ہوئے رُکی۔ اس کا جسم کانپ رہا تھا۔ نیک سنگھ نے اس کے جسم کو نیچے سے اوپر تک دیکھا۔ پھر دوسری طرف غٹرغوں غٹرغوں کرتا ہوا بچہ دیکھا "اگر یہ چاقو تمہارے گلے کے پار ہو جائے تو کیا ہو گا۔"

"جان نکل جائے گی" کملا نے کہا۔ اس وقت وہ پسینہ پسینہ تھی "اور اس کے اوپر چڑھ کر کھڑا ہو جاؤں تو" بچہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نیک سنگھ نے کہا۔ کملا نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیئے اور کچھ بڑبڑائی جو سمجھ میں نہیں آیا۔ "سُنو" نیک سنگھ نے پھر کہا کملا کو یہ لفظ تھپڑ کی طرح لگا اس نے دیکھا "تم مجھ سے اپنی آبرو بچا سکتی ہو؟"

"نہیں"

"میں جو چاہوں کر سکتا ہوں"

"ہاں" کچھ رُک کر پھر بولی "لاکھوں میں کوئی ایسی عورت نکلتی ہے جو مرد کا مقابلہ کر سکتی ہے اور آبرو بچا سکتی ہے، وہ طاقت مجھ میں نہیں ہے۔"

"بتاؤ تم کیا چاہتی ہو؟"

"آبرو اور زندگی" ہاتھ جوڑے ہوئے کملا گڑگڑائی۔

"مگر تمہارے شوہر نے ایسی دیا کرنا سکھا ہی نہیں اس لئے میں سب کچھ کروں گا آبرو بھی لوں گا اور جان بھی" کہتے کہتے نیک سنگھ چاقو لے کر کملا کی طرف بڑھا وہ خاموش کھڑی تھی جیسے کہ اس میں جان ہی نہیں تھی۔ نیک سنگھ نے کملا کو دونوں بازوؤں میں ایسے لے لیا جیسے مدت کے بعد بھائی بہن سے ملتا ہے کملا نے کچھ مخالفت نہیں کی پھر الگ کھڑا ہو گیا "میں ہتھیار کی جیت پر یقین نہیں کرتا ہوں میں تیری خواہش منظور کرتا ہوں نہ جان لوں گا نہ آبرو۔ تیرا ہی شوہر یہ کام کر سکتا ہے میں نہیں" کہتے کہتے نیک سنگھ نے چاقو زمین پر پٹک دیا اور باہر چل دیا۔ کملا کے جسم میں ایسے جان آگئی جیسے ٹھنڈ سے سکڑے ہوئے سانپ کو

دھوپ کی تپش لگنے پر آتی ہے۔" اے نیک انسان تیرا نام کیا ہے؟" کملا نے اس سے پوچھا" اپنے جملے میں تلاش کر" کہتا ہوا نیک سنگھ رات کی تاریکی میں چلا گیا۔ کملا کواڑیں بند کر کے واپس لوٹ آئی وہ رہ رہ کر سوچ رہی تھی کہ ضرور جذبۂ انتقام کے تحت ہوا ہے۔ اس کے شوہر سے کہیں کچھ ظلم ضرور ہوا ہے۔ یوں سوچتے سوچتے اس نے ساڑی اٹھائی پہنی پھر چاقو اٹھایا۔

"ارے یہ چاقو اس کے پاس کیسے آیا یہ تو وہی چاقو ہے جو رام لیلا کے میلے میں گوکل نے خریدا تھا اور اپنا نام کھدوایا تھا" چاقو کو گھما پھرا کر دیکھتی جاتی تھی اور سوچتی جاتی تھی۔ اتنے ہی میں پھر کسی نے کواڑیں کھٹکھٹائیں لیکن وہ اتنی ڈری ہوئی تھی کہ بولی ہی نہیں۔ اس کی خاموشی پہ پھر کوئی بولا۔

"کملا سنتی نہیں ہے کیا" کملا گوکل کی آواز پہچان کر اٹھی اور کواڑیں کھول دیں۔

"یہ کیا" کملا کے ہاتھ میں اپنا چاقو دیکھ کر بولا" دیکھوں یہ تو میرے چاقو جیسا ہے۔"

"جی ہاں آپ کے جیسا ہے بلکہ بالکل آپ ہی کا ہے لیجئے" ہاتھ کو بڑھاتے ہوئے کملا بولی۔

"یہاں کیسے آیا" گوکل نے ہکلاتے ہوئے سوال کیا۔ کملا نے جواب میں ساری کہانی دہرا دی وہ یہ سن کر رونے لگا ..... کملا اس کے رونے کی وجہ سمجھ نہ پائی گوکل کی روح اس کو پھٹکار رہی تھی۔

اُدھر نیک سنگھ پر کشوری کی موت کا صدمہ اور غم برابر بڑھتا چلا جا رہا تھا اور وہ دماغی توازن کھو بیٹھا تھا جنگل جنگل مارا پھرتا تھا۔ اب اس کی یہ حالت تھی کہ کوئی بھی لال چیز دیکھ لیتا تھا تو فوراً "خون خون" کہہ کر شور مچانے لگتا تھا۔

ایک دن گوکل اپنی بیوی اور بچے کے ساتھ رکشا میں سنیما دیکھنے جا رہا تھا۔ نیک سنگھ پلیا کی آڑ میں بیٹھا نیچی نظر کئے دوب گھاس کے تنکے چبا رہا تھا۔ رکشے

کی کھڑکھڑاہٹ سے وہ چونکا سُرخ ساڑی دیکھتے ہی وہ چلانے لگا "خون خون" ان لوگوں نے اُدھر دیکھا "یہی تھا اس روز" کملا کے مُنہ سے اچانک نکلا "یہ وہی ہے" گوکل نے بھی نیچی نظروں سے اور رکشے والے نے بھی پیچھے مُڑ کر دیکھا۔ پاگل "خون خون" چلائے جا رہا تھا۔ ایک اینٹ رکشے کے پہیے کے نیچے آ گئی اور اس کا توازن بگڑ گیا۔ پہیے کا رم اچانک ٹیڑھا ہو گیا اور تیز رفتار رکشا اُلٹ گئی پیچھے سے چلے آ رہے تیز رفتار ٹرک کو ڈرائیور ہو نیوالے اچانک حادثہ سے سنبھال نہ سکا اور نہ ہی جلد بریک لگے اور ٹرک سڑک پر پڑے ماں بیٹے کو کچلتا ہوا نکل گیا۔ پاگل پھر چلایا "خون خون"۔ اب کسی نے بھی اس کی آواز نہیں سُنی تھی مگر وہ برابر چلائے جا رہا تھا۔

"بابو جی میری تو کوئی خطا نہیں ہے" ہاتھ جوڑے رکشے والا گڑگڑا رہا تھا۔

"واقعی تیری کوئی خطا نہیں ہے۔" دونوں لاشوں کو غور سے دیکھتے ہوئے گوکل نے کہا۔ رکشا والا ایک طرف گھبرایا ہوا کھڑا تھا اور راہ گیر اکٹھے ہو گئے تھے سب کی نظریں ماں بیٹے کی لاش پر تھی اور گوکل دیکھ رہا تھا پاگل کی طرف۔۔

گوکل کو کشور زی کی بددُعا یاد آ رہی تھی اور وہ سوچ رہا تھا کہ اس دور کی دروپدی کی بددُعا بھی اثر رکھتی ہے۔

گاؤں کی عزّت

نرورا پاور ہاؤس کے چیف انجینئر مسٹر برجموہن پانڈے معہ بیوی اور دو بچوں کے دہلی سے ایک برات میں شرکت فرما کر واپس لوٹ رہے تھے۔ متھرا روڈ پر دوڑتی ہوئی کار اچانک ہی مسنگ کرنے لگی۔ ڈرائیور نے یہ سمجھتے ہوئے کہ پٹرول ٹیوب میں کچرا پھنس گیا ہوگا کچھ دھیان نہ دیا حسنِ اتفاق کہ کار کا مسنگ از خود ٹھیک ہوگیا۔ سب کی اداسی جاتی رہی۔ ڈرائیور سنجیدگی سے کار چلاتا رہا مگر چھ سات کلومیٹر کے بعد کار میں پھر وہی حرکت ہوئی اور چار پانچ فرلانگ چل کر ایسی رکی کہ "زمیں جنبد نہ جنبد گل محمد" گرمی کا موسم ڈرائیور نے بہت کوشش کی مگر بات سمجھ میں نہیں آئی وہ اپنے علم اور تجربے کے مطابق مقدور بھر کوشش کر چکا تو ماتھے کا پسینہ پوچھنے کے بہانے سڑک پر دور تک کسی آنے جانے والی گاڑی کو تاکنے لگا تاکہ کسی دوسرے ڈرائیور سے اپنی پریشانی کا حل نکالے۔

اسے ایک لوڈ ٹرک آتا ہوا نظر پڑا اس نے فوراً پیچ کس بونٹ پر رکھ کر اس کو ہاتھ دیا۔ ٹرک برابر آکر رک گیا ٹرک ڈرائیور نے باہر جھانکا "کی گل اے" کار مسنگ کر کے اچانک رک گئی بہت کوشش کرنے پر بھی بات سمجھ میں نہیں آرہی ہے۔ کار ڈرائیور بولا

"اچھا جی" کہہ کر سردار جی باہر آئے اور انھوں نے ضروری باتوں پر دھیان دیا "بھائی جی تو اڈا کوال نیل اے۔ بالکل جل گیا اے" سردار جی نے کہا۔

"میرے نال دلی چلو ہور لیا کے لگا لو، اس دے علاوہ ہور کوئی چارہ نہیں جے" یہ سُن کر ڈرائیور کچھ سُست ہو گیا اور سوچنے لگا۔ پانڈے جی نے نرمی سے کہا "سوچنے کا وقت نہیں ہے لو دو سو روپے اور فوراً جاؤ شام ہو رہی ہے"۔ ڈرائیور سردار جی کے ساتھ چلا گیا۔ پانڈے جی نے گھڑی پر نظر ڈالی پھر مسل کے پتھر کو دیکھا "اکتالیس کلومیٹر دُور ہے دہلی" وہ بڑبڑائے اور من ہی من میں کہنے لگے دو گھنٹے تو آنے جانے میں لگ جائیں گے اور مارکیٹ میں گھومنا پھرنا سامان دیکھنا بھالنا خریدنا کُل ملا کر چار گھنٹے ضرور لگ جائیں گے یعنی دس بجے تک اس جنگل میں سڑک کے کنارے معہ بچوں کے کھڑا رہنا خطرے سے خالی نہیں ہے مگر جائیں تو کہاں جائیں پانڈے جی سوچ رہے تھے اور ان کی بہو جی بچوں سے کہہ رہی تھیں "اگر تم لوگوں کو پیاس لگ رہی ہو تو اُس رہٹ پر پانی پی آؤ"۔

"اماں جی وہ مسلمان ہے دیکھو اس کی کتنی لمبی داڑھی ہے کہیں ہم کو مار کر کنویں میں نہ ڈال دے"۔

"بیٹی مُراد آباد کی گھٹنائیں یاد آ گئیں کیا۔ یہ باتیں شہروں میں ہوتی ہیں گاؤں میں نہیں ہوتیں۔ تم نے کبھی کسی گاؤں میں کرفیو لگتے سنا ہے"۔

"نہیں سُنا"

"بس تو جاؤ پانی پی آؤ دیکھو ان بڑے میاں سے کہنا بابا سلام ہم پانی پینا چاہتے ہیں کیا آپ اجازت دیں گے۔ اگر ہاں کر دیں تو پانی پینا"۔

"اور اگر نہیں پینے دیں تو چلے آنا"۔

"بیٹے وہ تم کو پانی پینے سے نہیں روکیں گے یہ تو تہذیب کی بات ہے جو تم کو سکھا رہی ہوں" یہ سُنتے ہی بچے اُچھلتے کودتے پانی پینے چلے گئے ماں ان کو پیار سے دیکھتی رہی۔

"مینا اب کیا ہوگا" پیچھے سے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پانڈے جی نے پوچھا۔

"کیا بتاؤں کیا ہوگا بڑے بے وقت خراب ہوئی ہے کوئی بستی بھی پاس نہیں ہے اور اُوپر سے رات پنکھ پسارے چلی آرہی ہے۔"

"بابوجی سلام" دونوں کی باتوں میں مخل ہوتے ہوئے کسی نے پیچھے سے سلام کیا اور ان کو اپنی طرف متوجہ کیا۔

"سلام بھائی صاحب" پانڈے جی نے سلام کرنے والے کو نیچے سے اُوپر تک دیکھا اور غور سے دیکھتے رہے۔

"بابوجی کار خراب ہوگئی ہے کیا۔"

"جی ہاں"

"ڈرائیور کہاں گیا ہے"

"دہلی سے کوال لینے گیا ہے۔"

"بابوجی وہ تو کافی رات گئے لوٹ کر آئے گا تب تک آپ معہ بچوں کے جنگل میں کھڑے رہیں گے۔ زمانہ ٹھیک نہیں ہے سارے مُلک کی فضا بگڑ رہی ہے دن دہاڑے پولیس کے سامنے تو آدمی آدمی کو مار دیتا ہے۔ کچھ دُور گاؤں میں میرا گھر ہے آپ رات میرے گھر مہمان رہئے۔ دن نکلے اپنے گھر تشریف لے جائیے تب تک ڈرائیور کار کی خرابی دُور کرلے گا آپ آرام کریں۔" یہ سُن کر پانڈے جی کچھ سوچنے لگے۔ بچے پانی پی کر آچکے تھے ریہٹ چلانے والا کسان اس طرف مُنہ اٹھائے دیکھ رہا تھا۔ اس نے ریہٹ روک دی اور اُدھر چل پڑا۔

"کیا کہہ رہے ہو کردار علی۔"

"ضمیر احمد میں تو کچھ نہیں کہہ رہا ہوں" کردار علی ضمیر احمد کو دیکھتے ہی گھبرا سا گیا اور اس سے بات نہ بن پڑی۔

"بابوجی کیا کہہ رہا تھا یہ لڑکا" ضمیر احمد نے پانڈے جی سے پوچھا۔ پانڈے جی نے اس کے الفاظ دُہرا دیئے۔ کردار علی میں گاؤں کا پردھان ہوں میرے ہوتے ہوئے یہ زحمت تم مت اٹھاؤ یہ لوگ میرے گھر مہمان رہیں گے تمہارے گھر نہیں"

اظہارِ تشکّر

میرے برادرِ محترم جناب وِدّیا پرکاش سرور تونسوی مُدیر شانِ ہند نے اپنی گوناگوں مصروفیات اور علالتِ مُسلسل کے باوجود "ماں سرور" کی اشاعت میں جس انہماک اور خوش سلیقگی سے اپنا فرض نبھایا ہے اس کے لئے میں صمیمِ قلب سے شکر گزار ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی صحت مندانہ درازئ عمر کے لئے خدائے برتر کے حضور التجا کرتا ہوں۔ تاکہ اردو کی بے لوث خدمت کا یہ سرچشمہ بدستور جاری رہے۔۔ ؏

ایں دُعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

پرستارِ انسانیت

ارمان بلاروی

یکم جولائی ۱۹۸۲ء

کہتے ہوئے ضمیر احمد نے اپنے گھر چلنے کی دعوت دی پانڈے جی نجھو کی طرف دیکھا۔ وہ بولی واقعی وقت خراب ہے یہاں رہنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ ایسے وقت میں کسی کو اپنا بنانا ہی اچھا ہے آگے جو ایشور کو کرنا ہے کرے گا اور پھر یہ تو کسان ہیں۔"

"کیا مطلب" پانڈے جی نے سوال کیا۔

"کسان اور مزدور مکار نہیں ہوتے ہیں چالاک نہیں ہوتے ہیں ان سے کسی کو نقصان نہیں پہنچتا ہے۔" بھولی۔

"بابوجی اندھیرا ہو رہا ہے جلدی چلو" ضمیر احمد نے کہا۔ بابوجی اگر آپ یہاں رہتے ہیں اور کوئی بات غلط سلط ہو جاتی ہے تو میرے گاؤں کی عزت خاک میں مل جائے گی کیوں کہ آپ کی کار میرے علاقہ میں خراب ہوئی۔ آپ نے شہر تو دیکھے ہی ہیں آج گاؤں بھی دیکھ لو۔" بابوجی کی اٹیچی اور بیلوں کی جوٹ لئے ہوئے آگے آگے ضمیر احمد باتیں کرتا چلا جا رہا تھا۔ لڑکوں نے بیل کھونٹے سے باندھ دیئے۔ کردار علی ضمیر احمد کے اس رویے پر ناخوش ہو کر چلا گیا بابوجی تو اس کو سمجھ نہ سکے لیکن ضمیر احمد نے اس حقیقت کو تاڑ لیا تھا۔

"فہیم اور نعیم"

"جی ابا جان" دونوں نے پاس آکر ادب سے کہا

"دیکھو بھئی یہ لوگ آج رات تمہارے گھر مہمان ہیں اور تم جانتے ہو کہ مسلمان کو مہمان کے ساتھ کیسا سلوک کرنا چاہیئے۔"

"جی ہم خوب جانتے ہیں"

"بس تو بیٹھک کھول دو اتنی خاطر تواضع ہو کہ میرے خاندان اور میرے گاؤں کی عزت پر حرف نہ آئے۔ دیکھو ان سے پوچھ کر ساری ضرورت کی چیزیں اندر رکھ دو۔ دودھ، چینی، برتن، نمک، چاول، دال، سٹوپ، تیل، دیا سلائی، پانی وغیرہ۔ اور دیکھو جب تک یہ لوگ کھانے پکانے سے فارغ نہ ہو جائیں بندوق

لئے یہیں کھڑے رہنا اور جب یہ سب طرح نبٹ جائیں تو آگے سے زنجیر ڈال کر تالا لگا دینا اور سڑک پر اپنی رہٹ کے پاس ان کی کار کھڑی ہے اس کی رکھوالی کرنا رات بھر جاگتے رہنا ہے جیسے اپنی بہن کی شادی میں رات بھر جاگے تھے۔"
دھیرے سے کہہ کر ضمیر احمد اندر چلا گیا۔

"بہت اچھا ابا جان" نہیم اور نعیم دونوں سُنتے تو رہے مگر پوچھنے کی خواہش ہوتے ہوئے بھی ڈر کے مارے نہ پوچھ سکے کہ مہمان کو تالے میں بند کرنے کا کیا مطلب ضمیر احمد بچوں سے اینٹوں کے ٹکڑوں کا ڈھیر چھت پر لگانے لگے دونوں بھائی باہر کھڑے کھڑے یہ سب دیکھ رہے تھے۔ آپس میں کانا پھوسی بھی کرتے تھے مگر کسی نتیجے پر نہیں پہنچتے تھے۔ بہو جی نے کھچڑی بنالی اور پردھان جی گھی کی بھری کنستری اچار کا پورا ڈبہ لے آئے۔

"پردھان جی یہ کیا کر رہے ہیں آپ۔"

"بابو جی بھاگ وان مہمان کے ہاتھ سے چھونے پر چیزوں میں برکت ہو جاتی ہے جو بچے گا اندر چلا جائے گا۔ میرا تو ایسا خیال ہے بابو جی کہ جس دن کوئی مہمان نہیں آتا اس دن میں اپنی بدنصیبی سمجھتا ہوں۔"

"پردھان جی آپ جیسے سبھی آدمی دُنیا میں ہو جائیں تو دُنیا رشکِ جنّت بن جائے۔"

"ذرہ نوازی کا شکریہ۔ بابو جی آج کی رات آپ کسی بھی ضرورت سے باہر نہیں نکلیں گے۔ بیٹھک سے ملا ہوا پاخانہ ہے، غسل خانہ ہے، جب بھی کوئی حاجت ہو اندر چلے جائیے مگر باہر نہیں جائیں گے۔"

"جب باہر سے تالا لگا ہوگا تو ہم باہر جا ہی کیسے سکتے ہیں" بہو جی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"بیٹی تم نے سُن لیا تھا کیا جو میں اپنے بیٹوں کو سمجھا رہا تھا۔ کہا تو بہت دھیرے سے تھا خیر آج تم سبھی لوگ میری باتوں پر عمل کرو گے۔ آداب عرض ہے۔

فی امان اللہ" کہتے ہوئے ضمیر احمد بھالا لے کر بیٹھک کی چھت پر جا بیٹھے اور وہیں کتے کو باندھ لیا ایک غلیل اور جھولے میں مٹی کے پکے ہوئے گولے تھے۔

پانڈے جی اور بہو جی اسی تذبذب میں رات کے بارہ بجے تک سو ہی نہیں سکے طرح طرح کی باتیں سوچتے رہے دونوں لڑکے کار کی رکھوالی کو سڑک پر جا چکے تھے اور دونوں الگ پیڑوں پر چڑھ کر بیٹھ گئے تھے۔ باپ کی سخت تاکید کے مطابق چستی کے ساتھ جاگتے رہے۔

اُدھر ایک بجے کے قریب گاؤں میں ایک طرف زور کی روشنی ہوئی، شور مچا "آگ لگ گئی آگ لگ گئی" یہ سُن کر بچے چونکے انھوں نے سختی کے ساتھ بیٹھک کی چھت پر سے کہا "تمھارے مکان پکے ہیں یہاں تک آگ نہیں آئے گی۔ سب اندر رہو باہر نکلنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"چاہے جل کر مر جاؤ" چھوٹی بہو بیگم نے دھیرے سے کھڑکی پر منہ رکھ کر کہا ضمیر احمد کے کان میں یہ الفاظ بھی پہنچ گئے اور انھوں نے پھر کہا "چاہے جل کر مر جاؤ مگر باہر نہیں نکلنا ہے۔ ہر ایک اپنے ہاتھوں میں کوئی نہ کوئی ہتھیار لے لے اور مستعدی سے بیٹھا رہے" یوں کہہ کر ضمیر احمد نے کتے کی زنجیر ہاتھوں میں لے لی اور اِدھر سے اُدھر گھومنے لگے عورتیں اندر ہی آپس میں باتیں کرتی رہیں کہ ہو سکتا ہے ہندو لوگ مارنے کو چڑھ آئے ہوں اور انھوں نے آگ لگائی ہو وہ طرح طرح کی باتیں سوچتی رہیں۔ پانڈے جی بہو سے بولے "یہ پردھان پاگل تو نہیں ہے کہ گاؤں میں آگ لگی ہے اور کہتا ہے کہ گھر سے باہر نہیں نکلنا ہے چاہے اندر ہی جل کر مر جاؤ جب اپنے گھر والوں کو نکلنے کی اجازت نہیں دے رہا ہے تو ہمیں باہر کیوں نکلنے دے گا ہمارا تو آگے سے تالا لگا ہوا ہے جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ اب تو تقدیر کے حوالے کر دو دن بُرے نہ ہوتے تو کار خراب نہ ہوتی اور وہ بھی شام کو اور بیابان جنگل میں۔" دونوں سوچ رہے تھے اور پریشان ہو رہے تھے پھر ضمیر احمد کی آواز آئی "الحمد للہ رب العالمین گاؤں والوں نے آگ پر قابو پا لیا وہ

بجھ گئی ہے" یہ سُن کر سب کے دم میں دم آیا اس طرح رات کے تین بج گئے اور بے فکر ہو کر جیوں ہی سب کو نیند آنے کو ہوئی کہ دھائیں دھائیں چار پانچ فائروں کی آواز آئی سبھی لوگ نیند سے بیدار ہو گئے۔

"ہائے اللہ میں تو مر گیا" رات کا سناٹا چیرتی ہوئی تیز آواز تمام فضا میں پھیل گئی کسی ہندو نے کسی مسلمان کو مار دیا" ہر ایک کے دماغ میں یہی ایک بات گھوم رہی تھی لیکن ضمیر احمد کے دماغ میں دوسری ہی بات تھی وہ چھت پر گھومتے رہے اور حالات کا جائزہ لیتے رہے۔ ان کا کلیجہ دھک دھک کر رہا تھا۔ آج فہیم یا نعیم میں سے کسی ایک کی جان ضرور گئی ہے۔" ضمیر احمد کے دماغ میں یہی ایک خیال رہ رہ کر آ رہا تھا، مگر انھوں نے کسی طرح دل کو سمجھا رکھا تھا، ڈھارس باندھے ہوئے اِدھر سے اُدھر گھومتے رہے۔ فائروں کے خوف سے تمام گاؤں کے لوگ سو نہیں پا رہے تھے۔ چڑیاں چہچہانے لگیں، سورج نکلنے کے آثار نظر آنے لگے۔ ضمیر احمد چھت سے نیچے اُترے اور بیٹھک کا تالا کھولا پانڈے جی کو سلام کیا اور باہر نکلا" دن نکل رہا ہے صاحب ضروریات سے فارغ ہو چکے ہوں تو ناشتہ کر لیجئے۔ میں دُودھ لے آیا ہوں اور یہ بسکٹ ہیں۔"

"پردھان جی آپ نے اتنی جلدی یہ سب تکلیف کیوں فرمائی ہے اتنے سویرے تو ہم لوگ گھر بھی ناشتہ نہیں کرتے ہیں اب تو چلنے ہی دیجئے ناشتے کے وقت تو ہم آگرے پہنچ جائیں گے" یہ سُن کر پردھان جی مُسکرائے اور چُپ ہو گئے۔ گھر کے چھوٹے چھوٹے بچے آس پاس کھڑے تھے "تم لوگ اندر جاؤ" انھوں نے کہا اور خود سامان اٹھا کر پانڈے جی کو کار کے پاس لائے۔ ڈرائیور کار کے پاس کھڑا تھا فہیم اور نعیم بھی اس کے پاس ہی کھڑے تھے دونوں کو بخیریت دیکھ کر ضمیر احمد کا دل باغ باغ ہو گیا اور جو غم تڑکے سے ستا رہا تھا کافور ہو گیا "پھر کون مرا تھا رات میں" لمحہ بھر کو من ہی من ضمیر احمد نے سوچا "ارے یہ کیا" کار کے پاس پہنچ کر ڈگی کے پیچھے پڑی لاش کو دیکھتے ہی ان کے منہ سے نکلا۔

"یہ تو وہی آدمی ہے جو کل مجھے اپنے گھر مہمان بنانا چاہتا تھا شاید کردار علی نام بتایا تھا اس نے" پانڈے جی بولے۔

"جی ہاں یہ وہی کردار علی ہے بدمعاش کہیں کا۔ ظالم بدچلن بدکار" ہونٹ بھینچتے ہوئے پردھان جی نے آگے پھر کہا۔ "اس کو کل شام آپ سے باتیں کرتے دیکھ کر ہی تو میں کل شام آپ کے پاس آیا تھا۔ مجھے سوجھ رہی تھی کہ یہ ضرور آپ کو دھوکا دے کر آپ کو اپنا مہمان بنالے گا اور رات کی تاریکی میں آپ کا سب کچھ لے لے گا عزت بھی جان بھی اور مال بھی اسی لئے میں نے آپ کو اپنے ساتھ لے جانے کی ٹھانی تھی۔"

"ہمیں اندر بند کیوں کیا تھا آپ نے۔"

"میں جانتا تھا کہ یہ اس رات کوئی سازش کر سکتا ہے وہی کیا بھی مکان کے چاروں طرف اس کے آدمی لگے رہے ہیں اس نے گاؤں میں ایک چھپر میں آگ لگائی تھی تاکہ سب لوگ باہر نکل آئیں اور اس کے چھپے ہوئے آدمی آپ کو اڑا لے جائیں اور اپنی مذموم خواہش پوری کرلیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ شیطان کی خواہش پوری نہیں ہونے دیتا ہے میں نے ان تمام باتوں کو سوچتے ہوئے ہی یہ انتظام کیا تھا جس کا مطلب آپ لوگ سمجھے نہیں ہوں گے چھوڑیئے اسے اور کار میں بیٹھ کر جلدی سے رخصت ہو جایئے ورنہ کوئی نئی مصیبت آسکتی ہے۔" جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے ضمیر احمد نے کہا سب لوگ کار میں بخوشی بیٹھ گئے۔ ضمیر احمد نے ۲۱ روپے نکال کر بہوجی کی طرف بڑھائے۔

"یہ کیسے پردھان جی؟"

"بیٹی تم نہیں جانتیں۔ ہم لوگوں کے یہاں سے جب کبھی بیٹی وداع ہوتی ہے تو خالی ہاتھ نہیں جاتی ہے۔ لو رکھو ان کو اور فی امان اللہ" مسکراتے ہوئے ضمیر احمد نے کہا بہوجی نے روپے پیشانی سے لگا کر پرس میں رکھ لئے اور کار اسٹارٹ ہوئی اس کا دھنواں کردار علی کا منہ کالا کر کے اوپر اٹھ گیا۔ ضمیر احمد نے فہیم اور نعیم کو اشارہ کیا کہ اس لاش کو سڑک کے کنارے گڑھے میں ڈال دیں۔

تپسیا کا پھل

"مہترانی تم نے یہ کیا بھیس بنا رکھا ہے۔ بڑھیوں کی طرح پھٹی پرانی میلی کچیلی دھوتی پہنے ہوئے ہو۔ ابھی تو تمھاری شادی کو ایک ہی سال ہوا ہے۔ یہی تو کھانے پہننے کے دن ہیں" سُریش نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

"بابو جی ہم لوگ غریب ہیں۔ بن ٹھن کر کیسے رہ سکتے ہیں۔ ایسے ہی کھیریت سے بکھت کٹ جائے تو بہت ہے" مہترانی نے سر پر دھوتی سنبھالتے ہوئے کہا۔

"ہماری مہترانی اس طرح رہے گی تو ہماری بدنامی نہ ہوگی؟ لو یہ پچاس روپیہ کا نوٹ اور ایک اچھی سی دھوتی خرید لینا" مہترانی نوٹ دیکھ کر ٹھٹھک گئی۔ اس نے ہاتھ آگے نہیں بڑھایا۔ اس پر سُریش نے پھر کہا۔

"لو بہن جی شرماتی کیوں ہو" بہن جی شرماتی کیوں ہو یہ فقرہ کئی بار اس کے دل و دماغ میں گونجا۔ اُس امداد کے پسِ پردہ اس کو کوئی غلط مقصد نظر نہیں آیا اور اس نے نوٹ لے لیا۔ دوسرے گھروں کو کماتی ہوئی اپنے گھر آگئی۔ وہ اس وقت بغیر کچھ کہے سُنے روپے لے تو آئی لیکن اس کی روح بے چین رہی رات بھر اس کے دل و دماغ پر وہ نوٹ منوں وزنی بنا رہا۔ طرح طرح کی باتیں اس کے دماغ میں آرہی تھیں۔ وہ جتنا سوچتی اتنی ہی پریشان ہو ہو جاتی۔ آخر کار اس نے یہ فیصلہ کیا کہ اُسے یہ نوٹ نہیں لینا چاہیئے تھا۔ صبح ہوتے ہی وہ سب سے پہلے سُریش کے گھر کمانے گئی اور نوٹ واپس کرتے ہوئے کہنے لگی۔

"بابو جی یہ لو اپنی امانت۔"

"کیسی امانت میں نے تو یہ نوٹ تمہیں امداد کے طور پر دیا ہے۔"

"مگر میری ساس نے اس امداد کو منظور نہیں کیا وہ بولی کہ اگر دینا ہی تھا تو سُرلیش بابو کی ماں دیتیں۔"

"تم نے اتنی سی بات اپنی ساس سے بھی کہہ دی۔"

"ایسی باتیں بڑے بوڑھوں کو بتانے ہی میں گھر کی عزت ہے۔"

یہ سُنتے ہی سُرلیش چپ چاپ آگے بڑھا اور صحن پار کر کے باہر کے دروازے کی کنڈی لگا دی۔ دروازے کی کنڈی لگانے کا کیا مقصد ہو سکتا ہے۔ پاروتی خوب سمجھ گئی۔ مگر سُرلیش تو کل بہن جی کہہ رہا تھا تو پھر آج وہ ایسا پاپ کیسے کر سکتا ہے اس طرح کے خیالات پاروتی کے دماغ میں آئے۔ سُرلیش نے آتے ہی اس کے ہاتھ سے نوٹ تھامنے کی بجائے اس کی کلائی کس کر پکڑ لی اور کمرے کی طرف کھینچنا شروع کر دیا "یہ کیا کر رہے ہو بابو جی؟" پاروتی نے ہاتھ چھڑاتے ہوئے تلخی سے کہا۔

"ایک رات رکھے گئے روپیوں کا سُود وصول نہیں کروں گا کیا؟"

"تم تو کل بہن جی کہہ رہے تھے اور آج میرے ساتھ یہ۔!" دانت پیستے اور پیچھے کو زور لگاتے ہوئے اس نے کہا۔

"وہ زبان سے کہا تھا دل سے نہیں۔"

"اب سمجھی کہ مردوں کی زبان دل سے الگ ہوتی ہے" یہ کہہ کر پاروتی پورے زور سے خود کو آزاد کرانے میں لگ گئی۔ سُرلیش بھی سمجھ رہا تھا کہ وہ بھاگ کر دروازہ کھول کر باہر نکل جانے کی کوشش میں جھپٹ رہی تھی۔ اس نے پاروتی کو دونوں ہاتھوں سے اوپر اٹھا لیا اور کمرے کے اندر اسے لے ہی جا رہا تھا کہ آواز آئی "سُرلیش دروازہ کھولو" (ماں کی آواز ہے یہ تو) سُرلیش نے فوراً بھانپ لیا اور پاروتی کو الگ کر دیا۔ دروازہ کھلتے ہی ماں اندر داخل ہوئی اور پاروتی بجلی کی سی تیزی سے باہر ہو گئی۔ "ماں اتنی جلدی کیسے آ گئیں"۔ "پوجا کا سامان جلدی جلدی

میں یہیں رہ گیا تھا اسے لینے آئی ہوں۔" ماں نے سادگی سے کہا۔ سُریش کو کیا پتہ تھا کہ اُس کی ماں نے باہر کھڑے کھڑے سارا تماشہ کواڑ کی درازوں میں سے دیکھ لیا ہے ماں بغیر کچھ بھید کھولے اور اُس سے سخت سُست کہے پُوجا کا سامان لے کر مندر چلی گئی۔ اکثر مائیں بیٹے کے عیوب پر پردہ ڈال ہی دیتی ہیں۔

پاروتی نے یہ واقعہ ساس کو نہیں بتایا مگر بناوٹی شگفتگی دل کی اُداسی کو نہ چھپا سکی۔ ساس کچھ پوچھے بغیر ہی مشکوک نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ مگر اس نے ضبط سے کام لیا۔ اس واقعہ کے تین چار دن بعد ساس نے بہو سے پوچھا "بیٹی پہلے تو کام کرنے میں چار پانچ گھنٹے لگ جاتے تھے لیکن اب تین چار دنوں سے تو بہت جلدی آجاتی ہے کیا بات ہے؟"

"ماتا جی سارے ٹھکانے میں نے پڑوس کی ایک مہترانی کو گروی رکھ دیئے ہیں اب میں صرف تین گھروں کا کام کرتی ہوں پروہت جی محمد نور اور گنگو نائی کا۔"

"تو نے اچھی آمدنی کے گھر گروی کیوں رکھ دیئے مجھ سے پوچھا تک نہیں۔ یہ لوگ وقت پر ہماری مدد کرتے ہیں اب وہ بھی راستہ بند ہو گیا۔ بیاہ میں قرض ہو گیا تھا وہ ادا نہیں ہوا ہے اب کیسے ہو گا۔"

"ماں جی ایک راستہ بند ہوتا ہے تو بھگوان دوسرا کھول دیتا ہے میں کم آمدنی میں بھی لوں گی مگر آبرو بیچ کر زیادہ رقم نہیں لوں گی۔"

ساس نے پاروتی کا حسین چہرہ دیکھا اس کا گداز جسم دیکھا اور پھر خاموش ہو گئی وہ سب باتیں سمجھ گئی اور بہو سے کہیں بھی کام کرنے کو نہیں کہا نہ جانے کیا کیا سوچ رہی تھی اس کی ساس کہ بہو نے خاموشی توڑتے ہوئے کہا۔

"ماتا جی کیا سوچ رہی ہو۔"

"بیٹی کتنی ہی باتیں ایسی ہیں جو تجھ کو بتانا نہیں چاہتی لیکن وہ سب باتیں چھپانے سے بھی کچھ فائدہ نہیں ہے تجھے معلوم ہے کہ تیرا پتی شراب پیتا ہے۔ بینک کی چوکیداری میں جو ملتا ہے سب پھونک دیتا ہے اب تک تو کوئی بات نہیں تھی۔

اکیلا تھا۔ اب شادی ہو گئی ہے۔ اگر یہ ڈھنگ اب بھی چلتا رہا تو لٹیا ڈوب جائے گی۔"

"ماتا جی تم چنتا مت کرو میں ان کی شراب چھڑا کر رہوں گی بکھت آنے دو میرے باپ نے جو خود بھی شرابی ہے شرابی لڑکا ڈھونڈ کر میری شادی کی تھی تاکہ ان کو بھی شراب پینے کو ملتی رہے لیکن ان کی یہ آرجو پوری نہیں ہونے دوں گی۔ میری ماں میرے باپ کی شراب نہ چھڑا سکی اور زندگی بھر روتی رہی میں اپنی پتی کی شراب چھڑا کر رہوں گی اور اپنے گھر کو سوگ بنا کر ہی رہوں گی۔"

"پاروتی" کسی نے دروازے پر آواز لگائی۔

"کون ہے۔"

"کیا باپ کو بھی نہیں پہچانتی پاروتی۔" پاروتی کے باپ نے ذرا اونچی آواز میں بولتے ہوئے کہا

تم فوراً چلے جاؤ۔ یہ دروازہ تمہارے لئے ہمیشہ کو بند ہو گیا ہے تم جیسا باپ بھگوان کسی کو بھی نہ دے، بند دروازہ کھولے پاروتی پیچھے لوٹ آئی اور کمرے میں آکر سڑک کی طرف دیکھنے لگی جہاں سے اسپتال کا پچھواڑہ خوب نظر آتا تھا اس کی نظر سامنے کوڑا دان پر گئی جس میں ہر روز صبح سے شام تک گئے پلاسٹروں کی روئی لاکر ڈال دی جاتی تھی۔ ڈاکٹر لوگ زخموں کی صفائی وغیرہ میں گندی بڑھیا روئی خراب کر کے باہر پھینک دیتے ہیں جس کا کوئی استعمال نہیں ہوتا وہ اس کے استعمال کا طریقہ سوچ رہی تھی۔ ساس باہر بیٹھی بیٹھی دروازہ پر ٹوہ لے رہی تھی کہ سمدھی ہیں یا چلے گئے۔ کئی بار ساس کے دماغ میں آیا کہ سمدھی کو دروازہ کھول کر اندر بلا لے مگر اس نے بہو کو ناخوش کرنا نہیں چاہا اور من مار کر رہ گئی اب تو سمدھی چلے بھی گئے تھے شاید کیوں کہ دروازہ پر کوئی آہٹ نہیں تھی۔ ساس اٹھ کر اندر آئی اور اپنا لحاف اوڑھ کر لیٹ گئی جو دسوں سال پرانا تھا اور اس کی روئی لوٹ کر غلاف کے اندر گیندوں کی طرح لڑھک رہی تھی۔ پاروتی بھی اپنی چارپائی پر لحاف

اوڑھ کر سو گئی۔

دن نکلا پاروتی نے سارا زیور باندھا اور ایک دوکان پر جا کر بیچ آئی۔ اس رقم سے اس نے پانچ کلو دودھ دینے والی گائے خریدلی۔ جب گائے گھر آئی تو ساس چونکی۔

"بیٹی گائے کہاں سے لے آئی" ٹھکانے گروی پر رکھنے پر جو روپے ملے تھے اُن سے"

"مگر اتنا دودھ تو ہمارے یہاں خرچ بھی نہیں ہوگا"

"ایک گلاس تم کو دوں گی ایک گلاس میں پیوں گی باقی دوکان پر بیچ آیا کروں گی"

"بیٹی ہم لوگ تو اچھوت ہیں ہمارے یہاں کا دودھ حلوائی نہیں لے گا"

"ماتا جی میں اچھے کپڑے پہن کر جایا کروں گی کوئی پہچان نہیں پائے گا مجھے اور پھر یہاں کے لئے تو میں نئی ہوں کون جانے کہ میں کون ہوں تھوڑی دیر کے لئے دھنوری بن جاؤں گی اور دوسرے محلّے کے حلوائی کے گھر جا کر بیچوں گی اور گائے کے گوبر کے اوپلے جلنے کے کام آیا کریں گے اور جو بچ جایا کریں گے وہ بیچ دیا کروں گی"

"مگر گائے کے کھانے کا خرچہ بھی تو ہوگا" ساس نے پوچھا۔

اوپلے بیچ کر بھوسا لے لیا کروں گی اور اسپتال میں روج صبح جا کر مریضوں کا باسی بُسیا شوکھا کھانا لے آیا کروں گی اس کو پانی میں بھگو کر اس کی سانی کر دیا کروں گی کھرچ کچھ بھی نہیں ہوگا۔ اس طرح دس روپیہ روج کما لیا کروں گی۔

"ہاں بیٹی شیخ چلی بھی ایسے ہی پلان بنایا کرتا تھا"

"ماتا جی مجھ میں اور شیخ چلی میں بہت انتر ہے" یہ کہہ کر پاروتی اُٹھی اور بازار چلی گئی اور وہاں سے دو چرخے لے آئی۔ صبح کو وہ ہسپتال کے کوڑا دان سے اچھی اچھی روئی چُن کر لے آتی۔ سب سے پہلے تو اس نے ساس کا لحاف بھروایا پھر شوہر کا لحاف بنوایا پھر دو لحاف اور دو گدّے آنے جانے والوں کے لئے تیار

نذرِ خلوص

اُردو افسانہ کی خوش رنگ وادی میں اپنے اس
نقشِ اوّل "مانِ سرودر" کو دلی خلوص کے
ساتھ اپنی بھاوج محترمہ سوشیل کماری
روحی دہلوی کے نام منسوب کرتا ہوں۔

طالب دُعا

ارمان بلاری

یکم جولائی ۱۹۸۲ء

کرائے پھر سوت کاتنا شروع کیا۔ صبح سے شام تک دونوں اتنا سوت کات لیتی تھیں کہ دس بارہ روپے کا بک جاتا تھا۔ اس طرح چھ سات سو روپے ماہانہ گھر میں آنے لگے۔ ایک دن جب پاروتی کمانے گئی تو اس کے پیچھے ساس ایک پڑوسی سے خط لکھوانے چلی گئی۔ لوٹ کر آنے پر پاروتی نے ساس کو گھر نہ دیکھ کر اِدھر اُدھر ڈھونڈنا شروع کیا دو گھروں کے بیچ میں بنی دیوار کے سوراخ سے جھانک کر دیکھا تو پڑوس والے گھر میں وہ خط لکھوا کر پڑھوا رہی تھی۔ پاروتی نے غور سے سننا شروع کیا۔ سب خط سُن کر وہ ہنسی اور چپ چاپ پیچھے ہٹ گئی اور اپنے چرخے پر آ بیٹھی ساس بھی آ گئی دونوں کاتنے لگیں لیکن نہ ہی ساس نے بھید کھولا اور نہ ہی پاروتی نے پوچھا کہ وہ کہاں گئی تھی۔ کچھ دیر بعد پاروتی نے کہا "ماتا جی تین مہینے ہو گئے ہیں انھوں نے کوئی پیسہ نہیں بھیجا ہے۔ اگر ہم یہ جگت نہ کرتے تو کیسے گذر ہو پاتی"۔

"تو فکر مت کر بیٹی جب اچھے دن آنے کو ہوتے ہیں تو سب کام اچھے ہی ہوتے چلے جاتے ہیں۔ تیرے قدم جس دن سے اس گھر میں آئے ہیں مٹی بھی سونا بننے لگی ہے بھگوان نے چاہا تو تیری پرتگیا پوری ہو جائے گی۔"

"کون سی پرتگیا"

"وہی ایک شرابی کی شراب چھڑانے والی" یہ سُن کر پاروتی بڑی کھل کھلا کر ہنسی مگر اس ہنسی کی وجہ ساس نہیں سمجھ سکی۔ وہ بے چاری کیا جانتی تھی کہ پڑوسی سے بینک مینیجر اور لڑکے کو لکھوائے گئے خطوط اس نے سُن لئے تھے۔ ساس بھی اس کی ہنسی میں شریک ہو گئی اتنے میں باہر سے آواز آئی خط ہے۔

"کس کا" جلدی سے چرخہ چھوڑ کر پاروتی اٹھی ڈاکئے سے خط لیا اور پڑھا۔

"کس کا ہے کیا لکھا ہے" اپنا چرخہ بند کر کے ساس نے پوچھا۔

تمھارے بیٹے نے لکھا ہے کہ ماتا جی نے بینک مینیجر کو خط لکھا تھا کہ لڑکا شرابی ہے اس کی تنخواہ اس کی بجائے اس کی بیوی کو دی جایا کرے جیسے

مینیجر نے منظور کر لیا۔ اب تنکھا مجھے ملا کرے گی اور لکھتے ہیں کہ تم نے بہو کے گھر چلانے کے جو ڈھنگ لکھے ہیں اس سے میں بالکل بدل گیا ہوں اور شراب کبھی نہ پینے کی قسم کھا چکا ہوں اور تنکھا سچ مچ مجھے نہیں بہو کو ہی ملنی چاہئے جس کی بہو پاروتی جیسی ہو اس کی تنکھا ایسی بہو ہی کو ملنی چاہئے میں تو شرابی ہوں۔ بہو نے خط پڑھ کر چوما اور سینے سے لگا لیا اور مسکراتی ہوئی چرخے پر آ بیٹھی "ماتا جی تم نے اُن کو خوب بدلا"

"نہیں بیٹی یہ سب تیری تپسیا کا پھل ہے۔"

پف

میں اپنی آنکھوں کی جانچ کرانے کے لئے ڈاکٹر یو کے مکھرجی کے کلینک پر گیا تو اس کے کھلنے میں قریباً ایک گھنٹہ تھا۔ میں باہر ہی ایک بنچ پر بیٹھ گیا۔ جلدی اس لئے چلا گیا تھا کہ جنرل فیکٹری کلکتہ میں ملازم ہوں پہلے نمبر لگ جاتا تو ڈیوٹی پر جلدی چلا جاتا۔ اسی وقت ایک اندھا دس گیارہ سال کے لڑکے کے کندھے پر ہاتھ رکھے ہوئے رکشے سے آیا کلینک کے سامنے اترا۔ رکشے والے نے پوچھا۔

"بابا جلدی واپس چلو تو رکوں۔"

"تم جاؤ۔ کیا پتہ ڈاکٹر کتنی دیر میں آئے اور مجھے کتنی دیر میں چھٹی دے۔" اندھے نے جواب دیا اور میرے پاس ہی بنچ پر بیٹھ گیا لڑکا سامنے کھمبے سے لگا کھڑا رہا میں نے لڑکے کی صورت میں اور اس اندھے کی صورت میں بہت سی علامتیں ملتی جلتی دیکھیں وہ دونوں باپ بیٹے سے لگ رہے تھے میں نے اندھے سے پوچھا "بابا یہ لڑکا آپ کا کون ہے۔"

"پوتا ہے۔"

"کتنے بیٹے بیٹیاں ہیں آپ کے؟"

"دو بیٹے تھے اور وہ تھے اور ایک لڑکی تھی رونا۔" اندھا اتنا کہہ کر رونے لگا۔ میں نے سمجھا کہ لڑکی بہت ہونہار اور حسین ہوگی اور چل بسی ہے اس لئے اس کا دل بھر آیا ہے۔ میں نے اس کا موڈ بدلنے کے خیال سے دوسرا سوال کیا "بابا! کیا

تمھیں بالکل دکھائی نہیں دیتا؟" یہ سُن کر پہلے تو وہ میری بات پر ہنسا جیسے میرا سوال احمقانہ تھا۔ مَیں نے ایسا محسوس کرتے ہوئے من ہی من میں سوچا کہ میرے اس سوال میں کوئی نہ کوئی خامی ضرور ہے۔ ابھی مَیں سوچ ہی رہا تھا کہ وہ بولا۔

"بیٹا اگر میں اندھا ہوتا تو یہاں علاج کرانے کیوں آتا۔"

یہ سُنتے ہی مَیں اس کے ہنسنے کا کارن سمجھ گیا اور اپنی جھینپ مٹاتے ہوئے اس کی بات بڑی کر دی "صحیح کہتے ہو بابا۔ تمھیں کتنا دکھائی دیتا ہے۔" ایک گھنٹے کا وقت تو بتانا تھا ہی یوں ہی گپ شپ سہی۔

وہ بولا "بیٹا ایک آنکھ میں موتیا بند کا پانی آچکا ہے اور بالکل دکھائی نہیں دیتا ہے دوسری کچھ ٹھیک تھی سو اس میں بھی پانی آنا شروع ہوگیا۔ اب تو کام چلانے لائق ہی دکھائی دیتا ہے۔ دیکھو وہ لنگڑا آتا ہوا دکھائی دے رہا ہے، اس کے کپڑے سفید ہیں، ایک پیر میں جوتا ہے۔ دوسری ٹانگ گھٹنے تک کٹی ہوئی ہے، ایک بغل میں بیساکھی لگی ہوئی ہے دوسری میں جھولا لٹک رہا ہے۔ چہرہ صاف صاف دکھائی نہیں دے رہا ہے" اتنا کہہ کر اندھا چُپ ہوگیا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر لنگڑے کو دیکھتا رہا۔ اب لنگڑا ہمارے پاس ہی آچکا تھا۔ مَیں نے اسے سر سے پیر تک دیکھا وہ تھکا ہوا سا لگ رہا تھا۔ ہوسکتا ہے بیساکھی بغل میں چبھتی ہو اور وہ اسی لئے کچھ سستانے کے لئے کھڑا ہوگیا۔ مَیں نے کچھ کہا نہیں وہ چپ چاپ کھڑا تھا اور ہم تینوں کی طرف باری باری سے دیکھ لیتا تھا۔ اس انداز سے میں نے یہی سمجھا کہ وہ کچھ چاہتا ہے اور مانگ نہیں رہا ہے اس لئے مَیں نے چار آنے نکال کر اس کے سامنے بڑھا دیئے اس نے لینے سے انکار کرتے ہوئے پیچھے ہٹ کر کہا "مَیں کوئی بھکاری ہوں۔"

"معاف کیجئے گا بھائی صاحب" مَیں نے بڑی نرمی سے کہا۔

"کیا انگ بھنگ بھیک ہی مانگ سکتے ہیں کچھ اور نہیں کر سکتے بھیک مانگنا بُری بات ہے اس سے آدمی کی خود داری پر حرف آتا ہے" یہ سُن کر مجھے دلی مسرت

..... ہوئی اور اب مجھے اندھے سے لنگڑا زیادہ جچنے لگا۔ اور اس سے باتیں کرنا شروع کر دیں۔

"تمہارے خاندان میں کتنے آدمی ہیں؟"

"صرف دو! ایک میں دوسرا بھگوان"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ تمہارا اور کوئی نہیں ہے۔"

"میں نے تو یہ نہیں کہا کہ میرا اور کوئی نہیں ہے۔" لنگڑے کی اس بات نے مجھے پھر مات دے دی میں پھر سوچ کر بولا۔

"تم کیا کام کرتے ہو" یہ سنتے ہی اس نے جواب دیئے بغیر کندھے پر پڑی جھولی میری طرف پھیلائی میں نے اس میں جھانکا تو دھان کی کھیلوں سے بھری ہوئی تھی اور ترازو بھی ساتھ ہی رکھی تھی لیکن باٹ کہیں نظر نہیں آ رہے تھے "یہ تو کھیلیں ہیں" میں نے کہا۔

"جی یہ کھیلیں ہیں" اس نے میرے ہی الفاظ دہرا دیئے اور پھر ایسے انداز سے گلا صاف کیا جیسے وہ لمبی بات چیت شروع کرنے والا تھا۔ وہ بولا "بابو جی میں گاؤں گاؤں گھومتا ہوں اور عورتوں کے سر کے ان بالوں کے گچھوں کو جو کنگھی کرتے وقت جھڑتے ہیں کھیلوں کے برابر تول کر اکٹھا کر لیتا ہوں ان سے طرح طرح کے پف بناتا ہوں۔"

"ہاتھوں سے یا مشین سے"

"جی شروع شروع میں تو ہاتھوں سے ہی بناتا تھا اب بینک سے پف بنانے کی مشین لون میں مل گئی ہے۔"

"تمہاری تعلیم کیا ہے"

"بی اے پاس ہوں"

"ایک گریجویٹ ہوتے ہوئے ایسے کام کی نسبت تو آپ اگر دس پانچ ٹیوشن کر لیتے تو بہتر کما لیتے اور اس کے ساتھ ساتھ عزت بھی ہوتی۔ لنگڑا عجیب و غریب

مسکراہٹ لبوں پر لئے کہنے لگا۔

"مجھے پف بنانے میں جو مزہ آتا ہے وہ دُنیا کے کسی بھی دھندے میں نہیں آسکتا تھا۔ میں روپیہ تو کئی طریقوں سے کما سکتا ہوں مگر وہ دولت سکونِ قلب نہ دے سکتی۔ سکونِ قلب تو کوئی مقصد پورا ہونے میں ہے دولت جمع کرنے میں نہیں" یہ کہہ کر اس نے بیڑی سُلگائی اور اتنی زور سے دم لگایا جیسے کہ وہ اس کو ثابت ہی نگل جانے کی کوشش کر رہا ہے۔ اندھے سے لنگڑا زیادہ سادہ اور دلچسپ معلوم ہوا۔ میں نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے پوچھا "بھائی صاحب آپ کی ٹانگ کیسے کٹی ہے"

"کہانی لمبی ہے ذرا تسلّی سے بیٹھ کر سُناؤں گا۔ یہ کہتے ہوئے وہ اندھے کو ذرا کھسکا کر میرے پاس بیٹھ گیا۔ اور بولا۔

"آج سے قریباً دو سال پہلے جب میں بی اے کر چکا تھا اور ایم اے میں داخلہ لینے والا تھا اسی وقت کی بات ہے۔" کہتے کہتے وہ کچھ رُکا اور اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے اس نے دامن سے آنسو پونچھے اور سنجیدگی کے ساتھ کہنے لگا "رونا نام کی ایک لڑکی تھی جو کہ چترنجن داس ڈگری کالج کلکتہ میں پڑھتی تھی" یہ سُنتے ہی اندھا بھی سرک کر بیٹھ گیا اور بڑے غور سے سننے لگا۔ "مجھے اس سے پیار ہو گیا مگر یہ کوئی بڑی بات نہ تھی بڑی بات تو یہ تھی کہ اسے بھی مجھ سے پیار ہو گیا تھا مگر مصیبت کا پہاڑ اس وقت ٹوٹا جب اس کے ماں باپ کو یہ معلوم ہوا کہ میں چٹ اپادھیایہ ہوں (وہ چٹرجی تھی اور یہ چٹ اپادھیایہ صرف گوتر کی بات ہے ہوتے دونوں ہی برہمن ہیں) لڑکی کے پتا پُرانے خیال کے تھے اس لئے لڑکی کو مجھے بھول جانے کے لئے زور دینے لگے مگر پیار اگر سچا ہو تو وہ ایسی باتوں کی پرواہ نہیں کرتا۔ لہٰذا اس لڑکی نے مجھ ہی سے شادی کرنے کے مضبوط ارادے کا اظہار کیا۔ بات اتنی بڑھی کہ گھر میں متواتر لڑائی رہنے لگی۔ اس بیچاری سے کوئی سیدھے مُنہ بات نہیں کرتا تھا۔ کڑے پہرے رہنے لگے۔ پڑھائی روک دی گئی جس سے وہ مجھے پانے سے نراش سی ہو گئی۔ گھر والے

بڑی تیزی سے کسی دوسرے لڑکے کی کھوج میں لگ گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ موقع پاتے ہی خودکشی کرنے ریل کی پٹڑی پر پہنچ گئی۔ سنجوگ کی بات کہ میں بھی رُکمنی اسٹیشن پر اپنی ماں کو لینے گیا ہوا تھا جو اپنے مائیکے سہل پائی گڈی سے ایک شادی میں شرکت کر کے واپس لوٹ رہی تھی۔ سامنے آتی ہوئی ریل گاڑی نے سیٹی دی میں نے جھانک کر دیکھا کہ گاڑی اسٹیشن سے کتنی دُور ہے۔ تو ایک لڑکی ریلوے لائن کے درمیان اسٹیشن کی طرف پیٹھ کر کے کھڑی ہوئی دکھائی دی۔ میں فوراً سمجھ گیا کہ یہ کوئی خودکشی کے ارادے سے کھڑی ہے۔ میں ریل گاڑی کی طرف اسے بچانے کے لئے بھاگا۔ پلیٹ فارم پر سبھی مسافر اُدھر ہی دیکھ رہے تھے اور اپنی اپنی جگہ کچھ نہ کچھ سوچ رہے ہوں گے جیسے ہی اس سے کچھ فاصلے پر پہنچا تو میں نے دیکھا کہ وہ رونا تھی۔ میں اور زور سے بھاگا اپنے جسم کی پوری طاقت کا استعمال کیا اور آواز دی "رونا گاڑی پاس آچکی ہے ہٹ جا ورنہ مرجائے گی"۔ وہ نہیں ہٹی میں نے پھر کہا "تو نہیں ہٹے گی تو میں بھی کٹ کے مرجاؤں گا"۔ اب کی بار اُس نے مجھے پیچھے مُڑ کے دیکھا اور پھر مُنہ پھیر لیا مگر ہٹی نہیں میں پوری طاقت سے بھاگتا ہوا اُس کے پاس پہنچ گیا گاڑی آتے آتے میں نے رونا کو گود میں اُٹھا لیا اور لائن سے باہر لے چلا۔ گاڑی سر پر آچکی تھی اُس کی بھیانک آواز میرے کانوں کو پھاڑے دے رہی تھی۔ بس میرا ایک پیر لائن میں رہ گیا تھا باقی پورا جسم باہر تھا فش پلیٹ سے جو ٹکرایا اور بیل بوٹم ایک بولٹ میں اُلجھ گئی۔ میں رونا کو لئے ہوئے لائن سے باہر گر پڑا۔ میری ایک ٹانگ کٹ گئی۔ میں نے رونا کو نہیں چھوڑا۔ مجھے خوف تھا کہ کہیں وہ پھر کرشن جی کے چکر کی طرح گھومتے ہوئے پہیوں کے نیچے نہ کُود پڑے۔ میری ٹانگ کو کاٹتے ہوئے گاڑی بزدل قاتل کی طرح اسٹیشن کی طرف بھاگ گئی۔ رُونا اُٹھ کر کھڑی ہو گئی میں صرف بیٹھ ہی سکا۔ ٹانگ جسم سے الگ کٹی پڑی تھی۔ خون بہہ رہا تھا۔ کچھ دیر تو رونا یہ سب کچھ دیکھتی رہی مگر بہت دیر تک اس دردناک منظر کی تاب نہ لاسکی اور نیچے گر گئی۔ اس کو غش آگیا تھا۔ اب میں اس کی مدد کرنے سے مجبور تھا۔ مجھے کچھ ہونے سا لگا تھا۔

میں نے دونوں ہاتھ سینے پر رکھے اور سینہ سہلایا تو بٹن میں اُلجھا ہوا رُونا کا پف میرے ہاتھ میں آگیا۔ میں نے اس کو سنبھال کر نکالا چوما اور رکھ لیا۔ رُونا کچھ کہہ تو نہیں رہی تھی لیکن افیونچی کی طرح آنکھیں ٹمٹما دیتی تھی۔ میں نے اُس سے کہا "رُونا زندگی جدوجہد سے حسین بنتی ہے تم اسی سے گھبرا گئیں اور خودکشی پر اُتر آئیں خودکشی ہی محبت کے لئے سب سے بڑی قربانی نہیں ہوتی ہے" وہ خاموش سُنتی رہی اور دیکھتی رہی۔

مجھے ریلوے کی پولیس اُٹھا کر لے گئی اور اسے بھی کوئی نہ کوئی لے ہی گیا ہوگا۔

اگلے دن وہ مجھے دیکھنے اسپتال پہنچی اور اپنے تپتے ہوئے گال میرے ہونٹوں پر رکھ دیئے۔ اور بولی "میں تو یہ سمجھ رہی تھی کہ اب انت ہو جائے گا مگر تم نے مجھے مرنے سے روک لیا۔ اب میں سماج کے بے جان اصولوں اور بندھنوں سے نہیں ڈروں گی اور تمھاری ہو کر رہوں گی۔"

اس کی یہ باتیں سُن کر میرا آدھا دُکھ گھٹ گیا۔ میں نے اس سے پوچھا "کیا تم گھر والوں کا مقابلہ کر سکو گی؟"

"تمھاری یہ قربانی مجھ سے سب کچھ کرا سکتی ہے" کہتے ہوئے میرے سینے سے چمٹ گئی اور روتی رہی اسی وقت ایک نرس آگئی اور میں نے رونا کو سیدھا بٹھا دیا وہ بیٹھی بیٹھی آنسو پونچھتی رہی۔ کچھ دیر بعد وہ نہ چاہتے ہوئے بھی مجبوراً گھر چلی گئی۔ اس کے جانے سے مجھے ایسا لگا جیسے میری جان نکل گئی ہو۔ میرا بازو بھی پھڑکا میری آنکھ بھی پھڑکی اس کے بعد پھر وہ مجھے آج تک نہیں ملی اس کا پف آخری نشانی کے رُوپ میں میرے پاس اب تک محفوظ ہے۔

میں نے پوچھا "وہ کہاں گئی؟"

"بھگوان کو پیاری ہو گئی"

"کیوں؟"

"اس نے زہر کھا لیا۔ کیونکہ گھر والوں کے طعنے لعنت ملامت گالیاں اس کو برداشت نہ ہو سکیں۔ اس کے علاوہ چارہ ہی کیا تھا۔ میرے علاوہ وہ کسی دوسرے سے شادی نہیں کر سکتی تھی۔ کنبہ اس کے خلاف تھا" یہ کہکر وہ زار زار رونے لگا اور ہچکی بندھی آواز میں کہنے لگا "یہی اس کی آخری دین ہے پف کے بالوں کی طرح میں بھی اس دھندے کے طفیل اس کی یاد میں اُلجھا رہتا ہوں۔"

اندھا میرے پاس سے یوں کہتا ہوا اُٹھا "بھگوان میں بالکل ہی اندھا ہو جاؤں تو اچھا ہے۔"

"کیوں بابا" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"تاکہ ٹھوکریں کھاتا پھروں۔ میں نے بھی تو کسی کو ٹھوکریں کھلائی ہیں۔ مجھے کسی کا دل دُکھانے کا نتیجہ ملنا ہی چاہیئے۔" یہ کہہ کر وہ چلا گیا اور آئی کلینک کھُلنے کا انتظار بھی نہیں کیا۔ لنگڑا سر جھکائے کچھ سوچ رہا تھا مگر میں اس راز کو نہ سمجھ سکا اور نہ ہی میں نے اندھے سے کچھ پوچھا۔

چپّل کی شرارت

"وحید برسات میں چپّل پہن کر باہر مت جایا کرو" ماں نے وحید کو سکول جاتے ہوئے سمجھایا۔

"کیوں؟" وحید نے بستہ کاندھے پر سنبھالتے ہوئے ماں سے پوچھا

"بیٹا راستے کی گندگی چپلوں سے اُچھل اُچھل کر کپڑے خراب کر دیتی ہے۔"

"تمھاری تو یہی باتیں رہتی ہیں ماں۔ دُنیا چپل پہن کر باہر نکلتی ہے۔" وحید یہ کہتے ہوئے گھر سے نکل کر باہر کھڑے ہم سکول بچوں کے ساتھ سکول چلا گیا لیکن جب وہ اسکول سے واپس آیا اور بستہ رکھ کر کپڑے بدلنے لگا تو ماں نے کہا "کپڑے بدلنے سے پیشتر میرے پاس آؤ۔"

"ابھی آیا اماں جی" اُچھلتا ہوا وحید ماں کے پاس آیا اور پوچھنے لگا کیا بات ہے ماں۔"

"تم پائجامہ بدل کر آؤ۔"

"ابھی لیجئے" وحید نے کمر بند کھولنا شروع کر دیا لیکن بارش کے باعث بھیگ جانے کی وجہ سے اس کی گرہ اس کے نرم نازک پوروں سے کھل نہیں پا رہی تھی ماں اس کی پریشانی کو تاڑ گئی اور اس نے وحید کے ازار بند کی اُلجھی ہوئی گانٹھ کھول دی تو وحید نے پائجامہ اُتارا تو اس کا پچھلا حصّہ دکھاتے ہوئے وحید سے کہا۔ برسات میں چپل پہن کر باہر اس لئے نہیں جاتے ہیں، ہو گیا نا تمھارا پائجامہ گندہ۔" وحید پائجامہ

تقریظ

قادرِ متعال کی قدرت کاملہ کا فیضِ عام کہئے یا حکمتِ بالغہ کا لطفِ خاص کہ حضرتِ ارمان ادیبی ایک طرف تو جملہ اصنافِ سخن کے شاہ سوار ہیں دوسری جانب تمام ارکانِ نثر کے علم بردار۔ نثر نگاری کا کوئی پہلو ایسا نہیں جہاں ان کے سمندِ قلم نے اپنی جولانیاں نہ دکھائی ہوں۔ افسانہ۔ مقالہ۔ ڈرامہ۔ ناول۔ کہانی وغیرہ میں ہر گام پر سلامت روی۔ سلاست وصداقت۔ روانی وحلاوت۔ تاثیر وملاحت۔ خلوص ورافت لطافت وحقیقت۔ تہذیب ونفاست۔ نزاکت وعذوبت اور حذاقت و نزہت کی برق پاش تجلیات اپنی ہوش ربا رعنائیوں سے ہر قاری کو مسحور کر لیتی ہیں۔ آپ کی افسانہ نگاری ایسی روایات جمع کر رہی ہے جو اپنے ہم عصروں اور بعد میں آنے والوں کے لئے خضر طریق ومشعلِ راہ ثابت ہوں گی۔ آپ کے افسانوں میں کرداروں کی سرگرمیاں۔ جذبات و احساسات اور خیالات کی پاکیزگی قابلِ ستائش ہے۔ آپ اس راز سے بخوبی آگاہ ہیں کہ کس کردار کو کب اور کہاں قصے کی دنیا سے اٹھا لیا جائے۔ وطن پرستی۔ انسان دوستی۔ آشتی ورواداری۔ اصلاحِ تمدن کے ساتھ ساتھ سیاست وتاریخ پر بھی نظرِ ثانی کی جا رہی ہے۔

حال ہی میں آپ کے افسانوں کا مجموعہ "مان سروور" کے حسین وجمیل نام سے منظرِ عام پر آ رہا ہے۔ "مان سروور" کے نام ہی میں وہ

پر مٹی کی بے شمار چپلیں دیکھ کر جھینپ گیا اور اپنی غلطی کو محسوس کرتے ہوئے کہنے لگا "اماں جی آپ ٹھیک کہتی تھیں میں اب کبھی چپل پہن کر باہر نہیں جاؤں گا لیکن ماں ایک بات بتاؤ بہت سارے بچے سکول میں ایسے آتے ہیں جو چپل پہنے ہوتے ہیں کیا ان کے ماں باپ انھیں تمھاری طرح نہیں سمجھاتے۔"

"ہو سکتا ہے وہ غریب ہوں ان کے پاس اور جوتے نہ ہوں یا پھر وہ بچے تمھاری طرح اپنی ماؤں کا کہنا نہیں مانتے ہوں گے۔"

یہ سُن کر وحید کو پھر شرم سی محسوس ہوئی کیوں کہ یہ بات بھی اس کے گال پر ایک طمانچہ ہی تو تھا۔ وحید اندر چلا گیا اور ماں اس کے بھولے پن پر غور کر رہی تھی اور من ہی من میں خوش ہو رہی تھی۔ کچھ ہی لمحوں کے بعد وحید کمرے سے باہر آیا اور بولا "اماں جی ایک بات تو بتاؤ سانپ آدمی کو کاٹ لیتا ہے تو آدمی مر جاتا ہے مگر سانپ خود کیوں نہیں مرتا جب کہ وہی زہر ہر وقت اس کے منہ میں بھرا رہتا ہے۔"

"بیٹا اگر ایک سانپ دوسرے کو ڈس لے۔۔۔"

ابھی وحید کی ماں بات پوری بھی نہ کرنے پائی تھی کہ پڑوسی رام چندر کے گھر سے غصے بھری آواز سنائی دی۔

"نُصرت کی یہ ہمت کیسے ہوئی کہ اس نے میری بہن کے پانی سے بھرے مٹکے میں پیچھے سے کنکر مارا۔" اس کے بعد دوسرے بھائی نے کہا "ہم تو پانچ بھائی ہیں اور وہ کُل دو ہی ہیں چلو اس کی ہڈی ہڈی توڑ دیں۔ ہندوؤں کے گاؤں میں ایک مسلمان کی یہ ہمت" اس پر تیسرے بھائی نے کٹی کاٹنے والی گنڈاسی کو ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا چلو آج اسے اس چھیڑ خانی کا مزہ چکھا دیں۔"

"دونوں بھائی باہر ہیں انھیں آجانے دو جب چلیں گے پھر پتا جی بھی تو یہاں نہیں ہیں۔ ذرا اور ٹھہر جاؤ۔" ایک بھائی نے کہا۔

"باہم تینوں کا رہیں جو اُن کے بغیر کچھ کر نہیں سکتے نُصرت تو کُل دو بھائی ہیں

اور ہم تین ہیں ان سے اب بھی زیادہ ہیں پھر ڈر کس بات کا۔ اگر بہن کے ساتھ اس سے بھی بڑی گھڑنا ہو جاتی تب بھی کیا ہم ان کا انتظار کرتے۔ دوسرے نے جواب دیا۔ ان الفاظ نے تینوں کے گال پر طمانچے کا کام کیا اور تینوں گھر سے باہر نکل پڑے۔

"آج خیریت نہیں ہے نصرت نے بُرا کیا ہے لیکن آپ اس مصیبت کو ٹالنے کی کوشش کیجئے گا ورنہ غضب ہو جائے گا، وحید کی ماں نے اپنے شوہر حمید سے کہا۔

حمید نے فوراً موقع کی نزاکت کو پہچان لیا اور باہر نکل گئے اِدھر اُدھر دیکھا وہ تینوں گلی میں کانا پھوسی کر رہے تھے "ارے بیٹے راد ھے کیا چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں کچھ میرے لائق خدمت ہو تو بتاؤ۔"

"تاؤ جی سلام" تینوں نے سلام کیا۔

"جیتے رہو بیٹو بڑی عمر ہو۔ کوئی خاص بات ہے کیا" کہتے کہتے حمید اُن کے پاس پہنچ گئے تینوں کے ہاتھ میں ہتھیار تھے۔ حمید نے سمجھ لیا کہ سچ مچ آج خیر نہیں ہے انھوں نے بڑی سنجیدگی اور سمجھداری سے کام لیا اور ہتھیاروں کی طرف نظروں سے اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگے "کیا آج کسی دشمن پر چڑھائی کا ارادہ ہے" جواب دیتے ہوئے ایک بھائی بولا "تاؤ جی نصرت نے ہماری بہن کے پانی سے بھرے مٹکے میں پیچھے سے کنکر مارا ہے ہم اس کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

"بالکل ایسا ہی ہونا چاہئے اس بدتمیزی کا جواب یہی ہے جو تم دینے جا رہے ہو بستی کی لڑکی چاہے کسی بھی قوم کی ہو سارے بستی والوں کی بیٹی ہوتی ہے اس کمینے کو اس کی سزا ملنی ہی چاہئے۔ تاکہ کسی دوسرے کو آئندہ اس قسم کی حرکت کرنے کی ہمت نہ ہو سکے۔"

"مگر اگر میری صلاح لو تو عرض کروں۔"

تینوں بھائی بیک زبان ہو کر کہنے لگے "تاؤ جی آپ حکم تو کریں، ہم آپ کا کہنا کیسے ٹال سکتے ہیں۔ ہمارے محلے میں آپ ہی ایک ایسے بڑے ہیں جس کا کہنا ٹالا نہیں جا سکتا ہے۔" بڑے بھائی نے کہا۔

"اگر تم نے اس نالائق کو قتل کر دیا تو پولیس تم تینوں کو گرفتار کر لے گی۔ سارے گھر پر مصیبت آ جائے گی وہ تو جان سے جائے گا ہی مگر تم کو عذاب میں ڈال جائے گا اُلٹے مجرم بننے سے کیا فائدہ اس کو سزا ملے اور تم بالکل بے داغ رہو تو کیسا رہے یعنی سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ میں اس کو چار آدمیوں کے سامنے بلاتا ہوں اور بات کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کی جائے گی۔ گاؤں کے اچھے اچھے معزز اور سمجھدار لوگ وہاں موجود ہوں گے جو وہ فیصلہ دیں گے وہی کیا جائے گا۔ ٹھیک ہے نا" حمید نے پیار سے سمجھاتے ہوئے تینوں بھائیوں سے کہا۔

"ٹھیک ہے تاؤ جی" اور گرمی کی دوپہر میں مرجھائے سبزے کی طرح تینوں سرخم کئے گھر کو چلے گئے۔ حمید نے بستی کے معززین کو بلایا اور نصرت کو بھی بلایا گیا۔ سب کے سامنے یہ مسئلہ رکھا گیا جس نے بھی سُنا نصرت کو تھوتھو کرتے ہوئے بُرا بھلا کہنے لگا۔ نصرت جو ایک مُلزم کی طرح ایک طرف کھڑا تھا، جھنجلا کر بولا۔

"تم لوگوں نے مل کر یہ کس خطا کی سزا دے کر مجھ سے بدلہ لینے کی ٹھانی ہے۔ ایک لڑکی کی غلط بات کو صحیح مان لیا اور مجھے غلط ٹھہرایا جا رہا ہے۔ یہ کیسا انصاف ہے۔"

"کیا تم نے اس کے مٹکے پر کنکری نہیں پھینکی؟" حمید نے پوچھا

"بالکل نہیں" نصرت نے پُر اعتماد لہجے میں کہا۔

"کوئی مجرم اپنے جرم کا اقبال تھوڑے ہی کرتا ہے۔" لچھی کے باپ رام چند نے خفگی کے لہجے میں کہا۔

"بالکل صحیح ہے ہر آدمی اپنے عیب کو چھپانے کے لئے کیا کچھ نہیں کرتا" حاجی غفار حسین نے کہا۔

"میں قرآن شریف کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں نے اُس لڑکی کے مٹکے کو کنکر نہیں مارا تھا میں تو صرف دروازے پر کھڑا تھا اور اس کی دونوں لمبی لمبی چوٹیوں کو دیکھتے ہوئے یہ سوچ رہا تھا کہ ہندوستان کی عورتیں ان چوٹیوں کو

بنانے میں ٹنوں سوت بیکار کر دیتی ہیں اگر سبھی عورتیں اندرا گاندھی کی طرح باب کٹ بال رکھنے لگیں تو لاکھوں لوگوں کے تن ڈھک سکتے ہیں۔ اسی دوران لچھمی نے میری طرف دیکھا تو مجھے اچانک اپنے اس خیال پر ہنسی آگئی اور یہ آگے بڑھ گئی بس مجھے کیا پتہ تھا کہ قوم کی بھلائی کے لئے سوچنا یہ مصیبت نازل کر دے گا" یہ بات سُن کر مسلمانوں کی پیٹھ کچھ بھاری ہوئی اور یک طرفہ شرارت کا پہلو اُبھرنا شروع ہوا۔ حمید نے لچھمی سے پوچھا" بیٹی تم کو کیسے یقین ہے کہ کنکر نصرت نے ہی مارا تھا"

"تاؤ جی اس وقت یہی باہر کھڑا تھا اور کنویں کے آس پاس دُور تک کوئی چڑیا بھی نہیں تھی۔ کنکر پیچھے سے لگا تھا اور یہ مسکرا رہا تھا۔ ایسی حالت میں آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ یہ حرکت نصرت کی ہی ہو سکتی ہے یا نہیں۔ رہا قسم کھانے کا معاملہ تو قسم کھائی ہی اسی لئے جاتی ہے کہ دوسرے دھوکے میں آجائیں" لچھمی نڈرتا سے یہ کہہ کر اور نظریں جھکا کر چُپ ہو گئی۔ کچھ دیر سب لوگ ایسے چُپ بیٹھے رہے جیسے کسی کی ماتم پرسی میں آئے ہوں۔ سب اپنی اپنی جگہ مسئلے کے سلجھاؤ کی ترکیبیں سوچ رہے تھے مگر وحید کو یہ خاموشی اچھی نہیں لگی اور اس نے بڑی خود اعتمادی سے کہا۔

"لچھمی بہن تم کنویں پر چپل پہن کر گئی تھیں کہ جوتے۔"

"چپل"

"بہن ذرا ادھر تو آنا" لچھمی اپنے باپ سے اجازت لے کر وحید کے قریب آگئی۔ سب لوگوں نے سوچنا چھوڑ کر دونوں کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔

"دیکھو ابا جی لچھمی بہن چپل پہن کر پانی بھرنے گئی تھی۔ چپلوں نے اتنی گندگی اُچھالی ہے کہ اس کی ساڑھی کمر تک خراب ہو گئی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کیچڑ سے لپٹا کنکر کا کوئی ٹکڑا اس کی چپل کے ساتھ اُچھل کر اس کے مٹکے پر جا لگا ہو اور یہ غلط فہمی کا شکار ہو گئی" یوں کہہ کر وحید سب کا مُنہ دیکھنے لگا جیسے کہ وہ اپنی صحیح تحقیق کی داد چاہتا ہو۔ سب لوگ مُسکرائے لچھمی بھی سر جھکائے ایک طرف

کھڑی ہوگئی۔ سب لوگوں کو یہ اُمید دکھائی دینے لگی کہ یہ مسئلہ حل ہوا ہی چاہتا ہے۔ نُصرت نے کھڑے ہو کر کہا "حمید چاچا بالکل ایسا ہی ہوا ہے اس کی چپل سے کوئی چھوٹا سا کنکر اچھل کر مٹکے پر جا لگا جسے یہ سمجھتی ہے کہ مَیں نے پھینکا ہوگا۔ یہ تو سبھی لوگ جانتے ہیں کہ چلتے وقت چپلوں کا تلوا ایڑیوں سے پٹاپٹ لگتا ہوا چلتا ہے اور چپل کی پچھلی نوک پر جو چیز آجاتی ہے وہ غلیل کی طرح اس کو اوپر اچھال کر پھینک دیتی ہے لہٰذا اس کی چپلوں کو سزا دی جانی چاہیئے۔ ہمیشہ اپنا ہی اپنے کا بُرا کرتا ہے غیر نہیں اس کے چپلوں نے اس کے ساتھ شرارت کی ہے۔

"میری تو پہلے بھی بہن کی طرح تھی اور آئندہ بھی بہن کی طرح رہے گی۔ اب کے سلونوں پر میں اس سے راکھی بندھوالوں گا ٹھیک ہے نا لچھمی" نُصرت نے لچھمی کی طرف متوجہ ہو کر کہا لچھمی مُسکراتی ہوئی چلی گئی اس کو اصل بات کا اندازہ ہو گیا تھا اور وہ سمجھ گئی تھی کہ نُصرت بے قصور ہے۔

"رام چندر تم اس بات سے مطمئن ہو گئے یا نہیں؟" حاجی غفار حسین نے پوچھا۔

"حاجی جی صحیح بات یہی ہے کہ نُصرت کی اس میں کوئی خطا نہیں ہے چپل ہی سے کوئی کنکری اُچھلی ہوگی جو مٹکے میں لگ گئی اگر نُصرت وہاں نہ ہوتا تو ملزم ہی نہ بنتا لچھمی کا شک صحیح نہیں ہے۔"

ضمیر فروش

سیٹھ گوپی چند متفکرانہ انداز میں کسی کا انتظار کر رہے تھے سمندری مدوجزر کی طرح ان کے پریشان دل و دماغ کے نقوش اُن کے چہرے پر بُری طرح اُبھر آئے تھے۔ گھسٹتا ہوا ایک بھکاری ان کے دروازے پر رُکا۔ یہ بھکاری آئے دن اسی محلے میں بھیک مانگتا تھا۔ زیادہ تر اہل محلہ اس سے شناسا ہو گئے تھے اس کا اصلی نام تو کوئی جانتا نہیں تھا مگر کھچیڑا پکارنے سے وہ اپنے مخاطب سے ہم کلام ہوتا تھا اس لئے سب محلے والے اسے اسی نام سے پکارتے تھے۔ بچپن میں اس کی دونوں ٹانگیں پولیو نے ماردی تھی جبھی سے یہ کھچڑ کھچڑ کر چلتا تھا۔ اس وقت اس کی عمر تیس سے اُوپر تھی۔ کبھی کبھی یہ بھکاری قصبہ کے اس محلے سے باہر چلا جاتا تھا تاہم علاقے کے کچھ رحم دل لوگ اُس کے پیٹ بھرنے کو کچھ نہ کچھ دیدیتے تھے۔ مگر آج سویرے ہی سے رِم جھم رِم جھم بوندیں پڑ رہی تھیں جس کی وجہ سے وہ زیادہ گھسٹ نہیں سکتا تھا۔ بھوکا ہونے کے باعث اس نے سوچا کہ یہ ایک امیر کا گھر ہے پیٹ بھرنے کے لائق کچھ نہ کچھ مل ہی جائے گا۔ لہٰذا اس نے بڑی عاجزی سے صدا لگائی۔

"سیٹھ صاحب صبح سے کچھ بھی نہیں کھایا ہے۔ بہت بھوکا ہوں کچھ کھلا دو تو بڑا پُن ہوگا۔"

"میرے یہاں لنگر کھُل رہا ہے کیا؟ جا آگے ایک مندر بھی ہے اور دھرم شالا

THIS EBOOK IS DOWNLOADED FROM
SHAAHISHAYARI.COM

LARGEST COLLECTION OF URDU
SHERS, GHAZALS, NAZMS AND EBOOKS.

بھی ہے وہاں کھانا بھی ملتا ہے اور رہنے کی جگہ بھی" سیٹھ نے بڑے روکھے انداز سے کہا۔

"سیٹھ صاحب اس کیچڑ اور بارش میں مجھ پر رحم کیجئے۔ وہ مندر بھی تو آپ جیسوں نے ہی بنوائے ہیں۔"

"دماغ کیوں چاٹتا ہے یہ سب کچھ تو تیرے نصیب میں لکھا ہے میں کیا کروں" بے التفاتی سے سیٹھ نے ٹالتے ہوئے کہا۔

"سرکار صرف دو روٹیاں دلا دو مجھے اور کچھ نہیں چاہیئے۔"

"اپنی ہی بات کہے جاتا ہے۔ ارے یہ کوئی روٹی کا وقت ہے چھ بج رہے ہیں، نو بجے تک کھانا بنتا ہے ہمارے گھر میں، اب تجھے کہاں سے روٹی دلا دوں۔"

"سرکار اتنے بڑے گھر میں دو روٹیاں نہیں نکلیں گی کیا، کئی روٹیاں تو بچوں کی جوٹھن ہی بچ رہتی ہوں گی۔ جوٹھن ہی دلا دو میں اس سے پیٹ بھر لوں گا۔"

"ہمارے یہاں بچا ہوا کھانا فوراً گائے کو کھلا دیا جاتا ہے۔"

"تو ایک روپیہ ہی دیدو کہیں سے کچھ لے کر کھا لوں گا" بارش کے چھینٹوں سے تر بالوں کو جھاڑتے ہوئے کھیڑا نے کہا۔

"ایک روپیہ۔ تُو تو ایسے مانگ رہا ہے جیسے تیرا کچھ ہم پر آتا ہے کیا زمانہ آگیا ہے کبھی فقیر ایک پائی سے خوش ہو جاتا تھا پھر پیسہ مانگا جانے لگا۔ پھر پانچ پیسے دس پیسے کا سکہ طلب کیا جانے لگا اب روپیہ مانگا جا رہا ہے۔ شرم بھی تو نہیں آتی روپیہ مانگتے ہوئے۔"

"سرکار دان دینے سے برکت ہوتی ہے ہمیں ایک دو گے تو بھگوان نہ جانے کتنا نفع کرائیں گے۔"

"بھکاریوں کو دان دینے سے کیا برکت ہوگی۔ سرکار نے تو جگہ جگہ یہ لکھوا دیا ہے کہ مہربانی کر کے بھکاریوں کو بھیک دے کر ان کی ہمت نہ بڑھائیے۔"

"سرکار جو کام کرتی ہے ٹھیک ہی کرتی ہے جو کچھ لکھا ہے ٹھیک ہی لکھا ہے۔

مگر اس نے بھکاریوں کو دینے سے منع کیا ہے محتاجوں کے لئے نہیں۔ اگر محتاجوں کی مدد کرنا بُرا ہوتا تو وہ خود سرکاری محتاج خانے کیوں کھلواتی۔"

"جا جا لیکچر مت دے روپیہ بڑی محنت سے پیدا ہوتا ہے یوں ہی لُٹانے کے لئے نہیں۔ ہم کسی دُعا بد دُعا کی چنتا نہیں کرتے یہ برکت ورکت کچھ نہیں ہوتی ان پرانی کہاوتوں کے ہم قائل نہیں ہیں، جو کچھ نصیب میں لکھا ہے ضرور ہوگا۔"

"ہو سکتا ہے سیٹھ جی جو کچھ آپ کہہ رہے ہیں وہ ٹھیک ہو میں آپ سے بحث نہیں کرتا۔ لیکن دُعا بد دُعا بھی ایک چیز ہے۔"

"ہم اس سے نہیں ڈرتے اور صرف بھگوان سے ڈرتے ہیں۔"

"آپ بھگوان سے بھی نہیں ڈرتے سیٹھ صاحب۔ من موجی ہیں من موجی۔ اُس روز چونے کی راکھ کے پاس تو ایک روپیہ بغیر مانگے ہی دیدیا تھا۔ آج مانگنے پر نہیں دے رہے ہو۔ مت دو آپ کی مرضی۔ مگر سیٹھ جی کسی کی بد دُعا نہ لینا اس سے تو عرش بھی ہل جاتا ہے۔ ویسے سیٹھ جی غرور اچھا نہیں ہوتا۔ کیونکہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ اونچے مکانوں میں رہنے والوں نے نیچا دیکھا۔ یہ کہتا ہوا کھچڑا گیٹ سے آگے بڑھ گیا اور ہلکے سے یہ بھی کہا کہ زمین پر کھچڑنے والا یہ محتاج ہی تھیں بھگوان کے حکم سے نیچا دکھانے کے لئے کافی ہے۔ مگر سیٹھ کو کچھ رحم نہ آیا۔ اس وقت سیٹھ صاحب اور ہی کسی دھُن میں تھے۔ کھچڑا لکڑی کی ٹال کی طرف بڑھ گیا۔ وہیں ایک لکڑی کے تنے پر ایک پاگل بیٹھا ہوا تھا اس نے کھچڑا کی طرف غور سے دیکھا اور اُنگلی کے اشارے سے اسے اپنی طرف بُلایا "یہ تو پاگل ہے جو بہت دنوں سے اِدھر اُدھر گھومتا پھرتا رہتا ہے۔ کیا پتہ بُلا کر اینٹ پتھر ہی مار دے"، مگر کھچڑا حوصلہ کر کے پاگل کے قریب گیا۔

"لو کچھ کھالو۔ تم بہت بھوکے ہو" کہتے ہوئے اس پاگل نے پھٹی پرانی میلی کچیلی جھولی میں چار تنوری روٹیاں جن سے دیسی گھی کی مہک آرہی تھی اس کی طرف بڑھائیں جن پر مرغ کا بھنا ہوا گوشت بھی تھا۔ کھچڑا نے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے بلکہ یوں کہئے بھوک نے پھیلوا دیئے۔ روٹیاں ہاتھوں پر رکھی تھیں اور سوچ رہا تھا "یہ پاگل ہے مگر اتنا اچھا

کھانا سنبھالے کیسے پھر رہا ہے۔ دوسرے اس کو کیا پتہ کہ میں بھوکا ہوں۔ بات کرنے کا یہ انداز پاگلوں کا تو ہو نہیں سکتا۔ پھر کون ہے" اس نے بہت کوشش کی مگر وہ کچھ نہ سمجھ سکا۔ زبان منہ ہی منہ میں ناگن کی طرح گھوم رہی تھی منہ میں بھر بھر کے پانی آرہا تھا جس کو بار بار نگلنے کی آواز صاف سنائی دیتی تھی۔ ایک نظر روٹیوں پر ڈال کر کھچیڑا نے پاگل کے چہرہ کو دیکھنا شروع کیا۔ پاگل کی مونچھوں اور داڑھی پر بلغم اور ریم لگی ہوئی تھی اور تار تار گندے پائجامے کے پیچھے بول براز سا لگا ہوا تھا جس پر سینکڑوں مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں جس سے کھچیڑا کے من میں گھن پیدا ہو گئی اور ہاتھوں پر رکھی ہوئی روٹی واپس کرتے ہوئے بولا "شکریہ آپ نے روٹی دے دی اور میں نے کھالی" کھچیڑا نے بھوک پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"تمہارا نام کیا ہے" پاگل نے نہایت اطمینان سے پوچھا۔

"مجھے کھچیڑا کہتے ہیں"

"کھچیڑا بھائی اگر تم بھوکے نہ ہوتے تو میری روٹیاں اپنے ہاتھوں میں نہیں لیتے۔ سیٹھ صاحب کے گھر دو روٹیاں نہیں مانگتے۔ تم جھوٹ کیوں بولتے ہو کہ بھوک نہیں ہے۔ میں تمہارے دل کی بات سمجھ رہا ہوں تم میرے ظاہرہ گندے ڈھنگ کو دیکھ کر گھبرا گئے ہو۔ میں پاگل نہیں ہوں ایک بہروپیا ہوں۔ میری ڈاڑھی مونچھیں نقلی ہیں اور ان پر لگی ہوئی گندگی ربڑی ہے ملائی کے بدلے ہیں۔ میرے پائجامے پر لکڑی کا برادہ اور شیرا ملا کر لپیٹا گیا ہے جس پر مکھیاں بھنک رہی ہیں تم اور سوچ رہے ہوگے۔ تم کھانا کھالو میں گندہ نہیں ہوں۔ تمہاری طرح صاف شفاف آدمی ہوں۔" پاگل نے کہا۔ اب کھچیڑا سمجھ گیا اور کھانا کھانے لگا۔ بہروپئے نے پانی لاکر دیا۔ کھانا کھا کر اور پانی پی کر اس کی جان میں جان آگئی اور آنکھیں کھل گئیں۔ کھچیڑا نے بے ساختہ کہا۔

"میں تمہیں بہت دنوں سے اسی بھیس میں دیکھ رہا ہوں اور وہ بھی اسی علاقے میں گھومتے ہوئے۔ ایسا کیوں ہے بہروپئے تو کئی مختلف روپ بھرتے ہیں اور

دل آویزی۔ دِل پذیری۔ دِل کشی اور دِل آفرینی ہے کہ نام سُنتے ہی چشم شوق اس کے جلوؤں سے ہم کنار ہونے کے لئے تڑپ اٹھتی ہے۔

"مان سر وور" کیلاش پربت کے پہلو میں ایک سروور کا نام ہے جو موتیوں کا خزانہ اور ہنسوں کی امان گاہ ہے۔ بعینہٖ اس کتاب کا ہر لفظ بھی ایک آب دار اور تاب ناک موتی ہے جس کے لمعات سے ہر چشم ناظر پُر نور اور ہر دِلِ قاری پُر سرور ہو گا۔ اُمید ہے شائقینِ ادب مصنف کی سعی کو مشکور بنائیں گے۔ دُعا ہے کہ خُدا حُسنِ قبول روزی کرے۔ ؏

این دُعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

خاک نشین

رتن پنڈوروی (ابوالبلاغت)

مہینوں ایک جگہ نہیں رہتے۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو کھچیڑا بھائی مگر مجھے یہی پارٹ پسند ہے اور میں اسی ایک رُپ میں بہت سا دھن کما لیتا ہوں۔ اچھا ایک بات بتاؤ" اس نے بات کا پہلو بدلا۔

"پوچھئے" دانت کریدتے ہوئے کھچیڑا نے کہا۔

"تم نے سیٹھ سے یہ بات کس بل بوتے پر کہی تھی کہ زمین پر کھچڑنے والا محتاج تمہیں مٹی میں ملانے کے لئے کافی ہے۔"

یہ سن کر کھچیڑا کچھ دیر تو مسکرایا اور چپ رہا۔ پھر کچھ سوچ کر بولا۔

"اس کا مطلب یہ ہے کہ تم یہاں بہت دیر سے بیٹھے تھے اور میری ساری باتیں سن رہے تھے۔ سنو یہ کالا دھندا کرتا ہے۔ صبح تھانے میں جاکر اس کی شکایت داروغہ جی سے کر دوں گا۔ بس پھر کیا ہے اس کی اینٹ سے اینٹ بج جائے گی۔ یہ سمجھتا ہے کہ میں اس کی کالی کرتوتوں سے واقف نہیں ہوں۔"

"کالے دھندے تو بہت سے ہیں یہ کون سا دھندہ کرتا ہے۔"

"افیون اور گانجے کا کام کرتا ہے۔"

"خود بیچتا ہے یا بکواتا ہے؟"

"میں یہ نہیں جانتا لیکن اتنا پتہ ہے کہ اس کے پاس منوں افیون اور گانجا جمع رہتا ہے۔"

"کہاں رکھتا ہے؟"

"یہ تمہیں کیوں بتاؤں یہ تو پولس کو بتانے کی بات ہے۔"

"کھچیڑا بھیا میں سی۔ آئی۔ ڈی کا آدمی ہوں نہ پاگل ہوں نہ بہروپیا صرف اسی بھید کو جاننے کے لئے مہینوں سے پاگل بنا پھر رہا ہوں مجھے اتنا تو پتہ تھا کہ نگینہ سے پورب میں ایک کلومیٹر کے فاصلے پر جنگی کے قریب آدھا بیگھا زمین سڑک کے کنارے بائیس ہزار روپے میں خریدی گئی ہے اتنی مہنگی زمین تو شہر میں بھی نہیں ہے پھر یہ زمین اتنی مہنگی کیوں خریدی گئی اور پھر اتنی مہنگی زمین میں کوئی اچھا اونچا

کام بھی نہیں کیا گیا۔ چاروں طرف اینٹوں سے دیوار بنا کر راکھ اور چونے کا کام کیا جا رہا ہے۔ اس ڈھنگ سے تو یہ ظاہر ہے کہ کوئی راز کی بات ہے اسی مسئلہ کو سلجھانے اور سمجھنے کے لئے میں یہاں گھومتا پھرتا رہا۔ لیکن منزلِ مقصود پہ نہیں پہنچا۔ آج تم نے یہ گتھی سلجھا دی۔"

"بڑے گہرے ہوتے ہو تم لوگ بھی" کھچیڑا نے کہا۔

"تم بھی کم گہرے نہیں ہو کھچیڑا"

"ہمارا گہرا تھلا ہی کیا ہے مالک۔ غریب آدمی امیر آدمی کے خلاف چل کر زندہ نہیں رہ سکتا اس لئے سب کچھ جانتے ہوئے بھی خاموش تھا۔ لیکن آج اس کنجوس نے مجھے ایسی چوٹ دی ہے کہ اس سے ٹکر لینے کو تیار ہو گیا ہوں۔ چلو اس کے گانجے اور افیون کی جگہ دکھا دوں۔" یوں کہتے ہوئے کھچیڑا سڑک کی طرف منہ کر کے گھوما۔ پاگل نے رکشا روکا اور دونوں سیٹھ گوپی چند کے گھر پر چل دیئے وہاں پہنچ کر وہ دونوں گھر کے پیچھے گئے کے کھیت میں چھپ کر بیٹھ گئے۔ کھچیڑا نے دھیرے سے کہا "یہاں روز ایک فیٹ کار آتی ہے چھ کے بعد۔ ڈالڈا گھی کے خالی پیپوں میں افیون اور گانجا بھر کے راکھ اور چونے کے گردے میں چھپا دیا جاتا ہے نکال کر کب لے جاتے ہیں اس کا پتہ نہیں۔" پاگل کو اس بات میں کچھ وزن معلوم ہوا۔ وہ بڑی غور سے سڑک کی طرف دیکھتا رہا اور ٹوہ لیتا رہا۔ بوندیں بھی تیز ہو گئی تھیں اور ہوا بھی سنسنانے لگی تھی تھوڑی دیر میں ایک کار کے آنے کی آواز آئی "کار آ گئی" فوراً کھچیڑا نے کہا۔

"تمہیں اتنی پہچان ہے اس کی کار کی۔ کوئی اور بھی تو ہو سکتی ہے۔"

"اسی کی کار ہے۔ مجھے خوب پہچان ہے۔ میں نے کئی بار اس کار کو یہاں آتے جاتے دیکھا ہے۔ دیکھو دھیمی پڑ گئی" سی آئی ڈی نے دیوار کے روزن سے جھانکا وہ رک گئی۔ کواڑ کھلی۔ کوئی باہر نکلا۔" کھچیڑا نے اندازہ لگاتے ہوئے کہا۔ پاگل جھانکتا رہا۔ ٹھیک کہتے ہو کوئی کار کی ڈگی میں سے پیپے نکال رہا ہے اور ادھر بڑھ رہا ہے۔ اس نے راکھ میں دبانے کے لئے جگہ ڈھونڈنی شروع کر دی۔" پاگل کھچیڑا سے پھسر پھسر کہہ رہا تھا۔ اسی وقت باہر کھڑے

آدمی نے کہا "ارے کہیں بھی دبا دے یہاں بارش میں کون دیکھ رہا ہے" اندر والے آدمی نے کوئی جواب نہیں دیا اور ٹینوں کو سنبھال کر راکھ میں دبا دیا گیا۔ کار چلی گئی۔

"تمہاری بات صحیح نکلی کھچیڑا تم تو بڑے کام کے آدمی نکلے۔ میرے مہینوں کے کام کو منٹوں میں پورا کر دیا۔ اس کام کے لیے میں زندگی بھر احسان مند رہوں گا۔ تم نے اتنی بڑی مدد کی ہے کہ میں شکریہ ادا کرنے کے لئے الفاظ بھی نہیں رکھتا۔ دیکھو میرے پاس ایک بیس روپے کا نوٹ ہے بطور انعام کے تمہیں دینا چاہتا ہوں کیا تم یہ معمولی سی بھینٹ منظور کرو گے۔"

بھینٹ کوئی بھی معمولی نہیں ہوتی ہے کیونکہ اس کے پس پردہ عزت افزائی کا جذبہ ہوتا ہے مگر بھوکے کو پیٹ بھر کے کھلانے سے بڑھ کر کوئی انعام نہیں ہو سکتا جو تم پہلے ہی مجھے دے چکے ہو میں تو ایک بیکار آدمی ہوں یہ میری خوش نصیبی ہے کوئی اور سیوا ہو تو بتائیے" نوٹ واپس کرتے ہوئے کھچیڑا نے کہا۔

"تم تھوڑی دیر یہیں بیٹھو میں ابھی آیا" کھچیڑا کو گود میں اٹھاتے ہوئے پاگل نے کہا اور باہر سڑک کے کنارے پیپل کے پیڑ کی چھایا میں بارش کے خیال سے لا کر بٹھا دیا۔ اور خود تھانے چلا گیا اور کھچیڑا بیٹھا بیٹھا سی آئی ڈی کی نشیب و فراز پر نظر دوڑاتا رہا تھوڑی دیر بعد داروغہ جی کی جیپ وہاں آکر رکی سی آئی ڈی بھی اسی میں تھا۔ کھچیڑا نے عالم تصور سے چونک کر اسے دیکھا۔ دس پانچ منٹ اور ٹھہرو میں ابھی آتا ہوں۔ ایک سپاہی بھی یہیں چھوڑتا ہوں جو تمہیں کہیں اچھی جگہ پر پہنچا دوں گا" سی آئی ڈی نے کہا اور جیپ تیز رفتاری سے چلی گئی۔

"مجھے اچھی جگہ تو موت ہی پہنچا سکتی ہے بابو جی" سی آئی ڈی کی بات کا جواب دیتے ہوئے کھچیڑا نے کہا۔ سپاہی نے تو کھچیڑا کی یہ بات سنی لیکن سی آئی ڈی اس جواب کو کم ہی سن پایا تھا۔

سیٹھ گوپی چند کے دروازے پر ہارن بجا۔ جیپ رکی۔ لوگ چونکے۔ چوکیدار باہر آیا۔ "کیا بات ہے صاحب؟"

"سیٹھ جی سے ملنا ہے۔ کہنا داروغہ جی ملنا چاہتے ہیں۔" چوکیدار اندر گیا اور سی آئی ڈی سے داروغہ جی بولے "وہ اپاہج کون تھا سر؟"

"میرا مددگار اسی نے تو سیٹھ جی کے کالے دھندے کا پردہ فاش کیا ہے۔ کبھی کبھی فٹ پاتھ کے لوگ بھی بڑے کام کے ہوتے ہیں"

"آخر ہیں تو وہ بھی اسی دیس کے باسی" داروغہ جی نے کہا اس کے بعد سیٹھ جی باہر نکل آئے۔ "آیئے داروغہ جی باہر کیوں کھڑے ہیں آپ"۔

"آ گیا۔ چلئے۔" ہتھکڑیوں کو پیچھے چھپائے ہوئے وہ کمرے میں داخل ہوئے سیٹھ صاحب نے ناشتہ پانی کے انتظام کے لئے نوکر کو آواز دی۔ داروغہ جی فوراً بولے "آج ہم آپ کے گھر ناشتہ نہیں کریں گے بلکہ اپنے گھر آپ کو ناشتہ کرانے کے لئے یہ لیتے آئے ہیں۔ یہ پہن لیجئے اور چلئے۔"

"کس خطا کی یہ سزا دی جا رہی ہے صاحب"

"یہ سی آئی ڈی صاحب ہیں ان کا کہنا ہے کہ آپ کے یہاں افیون اور گانجے کا کالا دھندا ہوتا ہے شہر سے باہر سڑک کے کنارے بنے گھر میں راکھ اور چونے کے ڈھیر میں آپ مال چھپا کر رکھتے ہیں۔"

"کیا آپ کو وہاں سے کچھ ملا بھی ہے؟"

"جنگل کی جگہ ہے صاحب کوئی چھپا کر بھی تو رکھ سکتا ہے۔ ہمیں پکڑوانے اور بدنام کرنے کے خیال سے بھی تو ایسا کر سکتا ہے۔"

"بک بک کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے سیٹھ" سی آئی ڈی نے کہا۔ سیٹھ جی نے داروغہ جی کو ایک طرف بلا کر کچھ کان میں کہا۔ داروغہ جی نے یہ بات سی آئی ڈی سے بھی کھول دی "سیٹھ جی بیس ہزار روپے دے رہے ہیں دس ہزار مجھے اور دس ہزار آپ کو۔ اگر یہ رقم لے لی جائے تو کیا بُرا ہے کیس یہیں ختم کر دیا جائے۔ آپ ہم دونوں گرہستی ہیں دُنیا اولاد کے لئے کماتی ہے۔"

"داروغہ نوٹوں کے لالچ میں فرض کو مت بھولئے۔ آپ پولیس انسپکٹر ہیں مجرموں

کی طرح ضمیر فروش کیوں بنیں۔ یہ رشوت نہیں ہے بلکہ پہلے نمبر کی ڈکیتی ہے۔"

"کیسے سر"

"ڈکیت رات کے اندھیرے میں گھروں کو لوٹتے ہیں۔ آپ دن دہاڑے ہی سب کے سامنے لوٹ رہے ہیں اور بے خوف ہوکر۔ ہوئی نہ پہلے نمبر کی ڈکیتی؟"

"سر ہم اور آپ دونوں ہی سرکاری ملازم ہیں نوکری سے زیادہ عزیز اپنی جان اور اپنی عزت ہے۔ یہ لوگ ظالم ہیں اپنی بچت کے لئے سب کچھ کرسکتے ہیں۔ اس وقت دولت عزت اور جان تینوں ہی مل رہے ہیں۔ ایسا نہ کرنے پر تینوں ہی ہاتھ سے چلے جائیں گے۔"

"اس کا یہ مطلب ہے کہ میں بھی تمہاری طرح بزدل بن جاؤں اور قانون طاق پر رکھ کر فرض کا گلا گھونٹ دوں اس عہدے پر مامور ہونے سے پہلے وفاداری کی جو قسم کھلائی جاتی ہے اس کو بھول گئے۔ چلو جلدی سے اس اسمگلر کو لے کر" سی آئی ڈی نے سختی سے کہا۔ داروغہ چپ چاپ سیٹھ جی کو گرفتار کرکے جیپ کی طرف لے چلے۔ سیٹھ جی کے منہ سے آتش فشاں پہاڑ سے نکلتے ہوئے لاوے کی طرح سخت سست الفاظ نکل رہے مگر کسی نے ان کی جلی کٹی باتوں کی پرواہ نہیں کی۔ سیٹھ جی کہہ رہے تھے "کسی عزت دار کو اس طرح بغیر جرم گرفتار کرکے لے جانا ٹھیک بات نہیں ہے۔"

"صحیح کہتے ہیں آپ۔ مگر آپ تو عزت دار نہیں ہیں آپ تو سمگلر ہیں مجرم ہیں دیش کے غدار ہیں" کہتے ہوئے سی آئی ڈی نے سیٹھ جی کو جیپ میں بٹھالیا۔ دھائیں دھائیں کی آواز آئی سب چونک گئے۔ جیپ جلدی سے گھر کی طرف روانہ ہوئی۔ زیادہ دیر تک رکنا خطرناک تھا۔ وہاں پہنچے تو گھبرائے ہوئے سپاہی نے جواب دیا۔

"میں تو بچ گیا صاحب مگر وہ محتاج مارا گیا۔"

"کیسے؟" سی آئی ڈی بولا۔

ایک موٹر سائیکل پر دو آدمی آئے پل بھر کو پیپل کے پیڑ کے نیچے ٹھہرے اور یہ کہتے ہوئے کہ اس حرام زادے نے ہی ہمارا بھید کھولا ہے آگے گواہی بھی دے گا۔ اس

لئے سب سے پہلے اسے ٹھکانے لگانا ضروری ہے اور اس محتاج کو گولی ماردی۔ میں اندر گھیر میں تھا۔ وہ ادھر بڑھے۔ میں فائر ہوتے ہی چونک گیا تھا اور ہوشیاری سے پوزیشن سنبھالے ہوئے کھڑا تھا۔ جیوں ہی انھوں نے اندر قدم رکھا۔ میں نے کڑک کر کہا۔ خبردار آگے بڑھے تو بھون دوں گا۔ ان کو میرے اندر ہونے کا اندازہ نہیں تھا۔ اچانک میری بات سُنتے ہی وہ گھبرا گئے اور بھاگ کھڑے ہوئے میری جان بھی بچ گئی اور راکھ میں دبا ہوا مال بھی۔"

"بھگوان کو ظالموں کی جیت منظور نہیں ہوتی۔ نکالو سب ٹین" سی آئی ڈی نے کہا۔ سارے سپاہی رائفلوں پر لگی سنگینوں سے کرید کرید کر افیون اور گانجے کے ٹین نکالنے لگے۔ اٹھائیس کلو افیون اور سینتیس کلو گانجا برآمد کر کے سب لوگ تھانے جا پہنچے۔ سیٹھ جی بیٹھے بیٹھے سب تماشا دیکھ رہے تھے اور من ہی من میں گھٹ رہے تھے۔ کاغذی کارروائی پوری کرنے کے بعد سیٹھ جی کو حوالات میں بند کر دیا گیا۔

سی آئی ڈی صاحب الگ کمرے میں آرام کرنے چلے گئے۔ اس کے بعد سیٹھ جی کے پاس حوالات میں ملنے داروغہ جی پہونچے "سیٹھ جی اب کیا کر سکتا ہوں۔ یہ سی آئی ڈی تو کسی طرح مانتا ہی نہیں۔" داروغہ جی نے عاجزی سے کہا۔

"ہندوستانی پولیس کا افسر کیا کچھ نہیں کر سکتا داروغہ جی"

"سیٹھ جی آپ ہی بتائیے کہ اب میں کیا کر سکتا ہوں؟"

پولیس کے آدمی ہو کر مجھ سے پوچھ رہے ہو کہ کیا کرنا ہے۔ بیس ہزار روپے اپنی جیب میں رکھو اور تلوار کی دھار اس خبیث کی گردن پر۔ لاش کو راتوں رات جیپ میں رکھ کر کہیں باہر لے جا کر کسی ندی میں پھینکوا دو، روز کتنے قتل ہوتے ہیں، ایک یہ بھی سہی۔ ورنہ اپنی موت کے لئے تیار ہو جاؤ۔ تم مجھ کو مروا تو سکتے نہیں جیل سے چھوٹ کر کبھی نہ کبھی تو واپس آؤں گا ہی تمھیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ ہو سکتا ہے میرے چیلے چانٹے اس سے پہلے ہی تمہارا کام کر دیں۔ خوب اچھی طرح سوچ لو۔"

"اچھا میں اس پر سوچ وچار کر لوں" یہ کہہ کر داروغہ جی واپس آ گئے اور سی آئی ڈی کے کمرے کے سامنے برآمدے میں اِدھر اُدھر ٹہلنے لگے۔ ان کے جوتوں کی کھٹ پٹ صاف سنائی دے رہی تھی۔ سی آئی ڈی کو اس طرح چہل قدمی کرنے پر اور وہ بھی رات کے دس گیارہ بجے شک ہو گیا اور وہ فوراً یہاں سے نکل کر باہر چلا گیا۔ داروغہ جی یہی سمجھ رہے تھے کہ یہ کسی اور ضرورت سے باہر جا رہا ہے ابھی آ کر سو جائے گا۔ مگر سی آئی ڈی تھانے واپس ہی نہ آیا اور نگینہ کی ایک دھرم شالا میں جا سویا۔

محنت اور عبادت

ہے بھگوان تو سب کی مدد کرتا ہے آج میری بھی مدد کر دے۔ میرے کھیت میں شام تک کا ہی کام رہ گیا ہے۔ اگر آج رات کو بارش ہو گئی تو پتہ نہیں یہ کپاس کب نرائی جائے۔ شکورہ جب بھی اذان کی آواز سُنتا ہے کھُرپا چھوڑ دیتا ہے یہ نہیں سوچتا کہ کسان کے کاموں میں وقت کی پابندی نہیں چلتی۔ دیر سویر کام چلتا ہی رہتا ہے۔ ہاں اگر اذان کی آواز نہ آئے تو سارا کام پورا ہو جائے۔ ہے بھگوان اتنی تیز ہوا چلا دے کہ آواز بوب کھو اُڑ جائے یا اذان کے وقت زور زور کی گرج ہونے لگے۔ جیسے بھی ہو اذان کی آواز نہ آئے یا مُلّا کو بیمار ڈال دے مگر مُلّا کے بیمار پڑنے سے تو یہ مسئلہ حل نہیں ہو گا۔ ہندوؤں میں تو صرف برہمن ہی پوجا پاٹھ کرتے ہیں لیکن مسلمانوں میں تو اکثر نماز پڑھتے ہیں اور اذان دینے والے بھی اور لوگ ہو سکتے ہیں۔ ارے میں تو بہک ہی گیا اور بھگوان کو ترکیبیں بتانے لگا۔ ہے بھگوان معاف کرنا۔ دل ہی دل میں بھیکا سوچ رہا تھا اور کپاس نرانے کے لئے کھُرپا چلانے میں اتنا محو ہو گیا کہ اس سے کپاس کے دو پودے کٹ گئے اور اسے پتہ بھی نہ چلا۔ شکورہ نے یہ دیکھ کر ٹوکا۔

"کیوں بھیکا کر دیئے دو پودے قتل کہاں ہے تیرا دھیان مجھ سے کٹ جاتے تو آسمان سر پہ اٹھا لیتا" یہ سُنتے ہی بھیکا چونکا اور سوکھ اُٹھے ہوئے آدمی کی طرح اِدھر اُدھر دیکھنے لگا "واقعی دو پودے کٹ گئے" اس کے مُنہ سے نکلا اور کپاس کے دو لال لال پودے گھاس کے مُٹھے کے ساتھ اس کے ہاتھ میں دکھائی دے رہے تھے

تازہ کٹے ہونے کی وجہ سے پودے کھلائے نہیں تھے اور کسی انسانی بچے کے کھلے ہوئے پنجے کی طرح کپاس کے پتے چمک رہے تھے۔ اسے ان دونوں پودوں کے کٹنے کا اتنا ملال تھا کہ شاید شہروں میں ہندو مسلم فساد میں کٹنے والے انسانوں کا بھی نہیں ہوتا ہوگا۔ اب تو یہ جم بھی نہیں سکتے۔ اس نے ہلکے سے کہا اور پودوں کی جڑیں دیکھنے لگا۔ "ارے ذرا سی جڑیں رہ گئی ہیں۔ شاید انہی کے سہارے پر پھر یہ ہرے ہو جائیں" خوش ہو کر کہتے ہوئے اس نے ان دونوں پودوں کو پھر الگ الگ گاڑ دیا اور اپنے پینے کا بچا ہوا پانی ان کی جڑوں میں انڈیل دیا "جو ہونا تھا ہو گیا پچھتانے سے بھی کیا ہوتا ہے رام ملک ہے وہ چاہے تو مُردے کو بھی جلا سکتا ہے" یہ کہتے ہوئے اُس نے جلدی سے کُھرپا اٹھا لیا اور بیکار گئے وقت کو پورا کرنے کی نیت سے پھر تیزی سے کام کرنے لگا جیسے جنگ میں سپاہی مرنے والوں کی فکر نہ کرتے ہوئے آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔

"اب ذرا دھیان رکھنا کام تو آج نہ ہو سکا تو کل ہو جائے گا مگر کٹے ہوئے پودے نہ آج ہرے ہوں نہ کل" شکورہ نے بیڑی سُلگاتے ہوئے کہا۔ بھیکا کے من پر یہ جملہ من بھر کے پتھر کی طرح ٹکرایا "کٹے ہوئے پودے نہ آج ہرے ہوں نہ کل" یہ جملہ پورے جسم میں زہریلے سانپ کے زہر کی طرح دوڑتا سا محسوس ہوا۔

"دھیان تو رکھوں گا ہی شکورہ مگر ان کٹے ہوئے پودوں کا ملال تھوڑے ہی چلا جائے گا۔ کل پرسوں انھیں آ کر پھر دیکھوں گا۔ یہ ہرے ہوتے ہیں یا نہیں" کہتے ہوئے اس نے اپنی پہچان کے لئے ایک لکڑی گاڑ دی اور کہنے لگا "اگر یہ پودے ہرے نہیں ہوئے تو بہت ہی ملال ہوگا کیونکہ ان دو پودوں پہ اتنی کپاس آتی کہ دو نیتاؤں کی ٹوپیاں بن سکتی تھیں"

"تم کو اُن کی ٹوپیوں کی فکر ہے۔ نیتاؤں کو اپنی کرسی کی فکر ہے دو رومال بھی تو بن سکتے ہیں" شکورہ نے کہا۔

"میں تو پیٹ کی روٹی اور سر کی ٹوپی کی بات کرتا ہوں اس سے بڑھ کر اور کچھ نہیں ہے" اطمینان سے بھیکا بولا۔

"ٹوپی تو صرف سر ہی ڈھکتی ہے مگر رومال تو کئی کاموں میں آتا ہے"۔ بیڑی کے ٹکڑے کو پیچھے پھینکتے ہوئے شکورہ نے کہا۔

"یہ تو ٹھیک ہے مگر" دُنیا کے کام ان دو ہی کے لئے کئے جاتے ہیں"۔ ہانپتے ہوئے بھیکا نے بات پوری کی۔

"کیسے ؟" شکورہ اپنی بات کٹتے ہوئے چونک کر بولا

"سارندھا، چمپت رائے، رانا پرتاپ، رانی لکشمی بائی، اُدھم سنگھ نے صرف ٹوپی کے لئے جان نچھاور کی تھی"۔

"ٹھیک ہے بھیکا مگر وہ اگلے زمانے کی بات تھی۔ اب تو ٹوپیوں کا رواج ہی گھٹتا جا رہا ہے لوگوں نے الفاظ کے معنی ہی بدل دیئے ہیں۔ کیسی ٹوپی کیسی عزت۔ آسٹریلیا میں ایک کلب تیار ہوا ہے جس میں نوجوان اپنی بیویوں کو ایک دوسرے کی بیویوں سے بدل لیتے ہیں اور رات بھر ایک دوسرے کی بہو ایک دوسرے کے گھر پوری رات گزارتی ہے۔ بھارت میں بھی کئی نوکر اپنے افسر کو خوش کرنے کے لئے اپنی دلہنیں پیش کر دیتے ہیں۔ کہاں رہی ٹوپی (عزت) کی بات۔ روٹی کی بات بھی غلط ہے کلنگ۔ پانی پت، ترائن اور پلاسی کی جنگیں کرنے والوں کو روٹی نہیں ملتی تھی کیا۔ اب آئی سمجھ میں کہ بات روٹی اور ٹوپی ہی تک نہیں ہے بلکہ ان سے آگے بھی کوئی اور چیز ہے جس کے لئے یہ عالم رواں دواں ہے۔

"ہاں شکورہ۔ بات ٹھیک ہی ہے کرسی روٹی اور ٹوپی کے علاوہ میں مان گیا مگر" اس کے علاوہ وہ کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ اچانک اس کی نظر ایک چوہے پر پڑی اور اس نے کہا "شکورہ تیرے سامنے سے چوہا بھاگ گیا تو نے اس کو کھرپے سے مار کیوں نہیں دیا"۔

"وہ جا رہا ہے"۔ بھیکا نے اشارہ سے بتایا۔ وہ مارنے کو سنبھلا ہی تھا کہ کہیں تاک میں بیٹھی چیل اسے پنجوں میں دبا کر جدھر سے اذان کی آواز آیا کرتی تھی اس طرف اڑ گئی۔ "جب کسی کی موت آتی ہے تو یوں آتی ہے"۔ بھیکا نے پھر نزائی میں جلتے ہوئے